اسلام
گفتگو
و
متمدّن معاشرہ
سیّد محمّد خاتمی

اسلام، گفتگو اور متمدن معاشرہ

از

سید محمد خاتمی

صدر، اسلامی جمہوریہ ایران

پیش لفظ

اندر کمار گجرال

سابق وزیر اعظم ہندوستان

مترجم

ڈاکٹر اختر مہدی

جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی، ہند

کتاب	اسلام، گفتگو اور متمدن معاشرہ
مؤلف	سید محمد خاتمی
مترجم	ڈاکٹر اختر مہدی
کمپیوٹر کمپوزنگ اینڈ ڈیزائننگ	گرافک ٹائم کمپیوٹرس، نئی دہلی۔۲
ناشر	جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی، ہند

اسلام

گفتگو

اور

متمدن معاشرہ

فہرست عناوین

پیش لفظ

اسلامی جمہوریہ ایران کے صدر سید محمد خاتمی ایک محترم اور نا قابل فراموش رہنما اور ایک عظیم محقق و دانشمند ہیں جن کے فلسفیانہ خیالات کو پوری دنیا غیر معمولی عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ انکی کتاب ''اسلام، گفتگو اور متمدن معاشرہ'' ایسے وقت پر شائع کی جارہی ہے جب کہ قدیم و بالغ النظر اور صلح پسند تہذیبیں ایک دوسرے کو بے بنیاد شکوک وشبہات کی نگاہ سے دیکھ رہی ہیں جس کی وجہ سے ہر قسم کی بنیاد پرستیوں کو سر اٹھانے کا موقع مل گیا ہے۔ متمدن اور مہذب معاشرہ، مسلسل گفتگو اور عالمانہ مذاکروں کے ذریعہ اس قسم کے مسائل کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ہم لوگ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ ایرانی تہذیب وتمدن نے ہماری تاریخ و تہذیب اور ہماری زبانوں پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ فردوسی کی شاعری، سلجوقی دور کی عمارتیں، تیموریوں کی نقاشیاں اور اصفہان کی مساجد درحقیقت ہماری اور ایرانی عوام کی مشترکہ میراث ہیں۔ یونیسکو (UNESCO) اجلاس میں ''نیا ہزارہ اور گفتگو'' نامی موضوع پر عزت مآب خاتمی صاحب کا خطاب نہایت فکر انگیز رہا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''تہذیبوں اور تمدنوں کے درمیان گفتگو'' کا محاورہ ایسی صفات کا حامل ہے جو بظاہر ایک دوسرے سے مختلف بلکہ متضاد معلوم ہوتی ہیں۔ گفتگو ایک طرف تو انسانی تہذیب وتمدن کی تاریخ جیسی قدامت کی حامل ہے لیکن دوسری طرف جدیدیت اور

تازگی بھی اپنے ساتھ لئے ہوئے ہے۔اس اختلاف کو سلجھانا اتنا مشکل کام نہیں ہے بشرطیکہ ہم گفتگو کے ظاہری اور حقیقی معنی ومفہوم مراد لیں جو گفتگو کی عرصۂ دراز سے رائج تاریخ کے مطابق بھی ہوں گی۔ بہر حال تہذیبوں کے درمیان گفتگو کے محققانہ بیان کو ایک وسیلہ قرار دیتے ہوئے تہذیب،تمدن اورانسان کی ایسی تعریف بیان کرنی پڑے گی کہ وہ گفتگو کی روح اوراس کے حقیقی جوہر سے نہ ٹکرائیں۔اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ہمیں انسانی وجود کے اجتماعی پہلو کی طرف خصوصی توجہ،انسانی تمدن کی وسعت وعظمت پر تاکیداوراس بات پر خصوصی زور دینا پڑے گا کہ دنیا کی کوئی بھی اہم وعظیم تہذیب تنہائی اور گوشہ نشینی کے عالم میں پروان نہیں چڑھی ہے۔ دوسری عبارت میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ عالمی تہذیبوں اورتمدنوں کے انہیں پہلوؤں کو بقاوفروغ حاصل ہوا ہے جن میں ترسیل وابلاغ کی توانائی وصلاحیت بدرجۂ اتم موجود تھی اور بولنا وسننا اس صلاحیت کا اہم جزو رہے ہیں ہیں۔پس تہذیبوں اور تمدنوں کے درمیان گفتگو کی تجویز میں بولنے اور سننے کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔سننا ایک صفت ہے جو ہر شخص میں آسانی سے نہیں پائی جاتی ہے بلکہ یہ صفت پیدا کی جاتی ہے اوراس کام کے لئے ایسے مسلسل تربیتی کورس کی ضرورت ہوتی ہے جس کے ذریعہ انسان کی اخلاقی، ذہنی اور عملی صلاحیتوں کو فروغ دیا جاسکے۔سننا ایک مجہول اور بیکار عمل نہیں ہے بلکہ یہ مسلسل عملی سرگرمی کا نام ہے جسمیں خطیب سامع کی خدمت میں اپنی تخلیقی،اکتشافی،آزمودہ اور تجرباتی دنیا کا ایک منظر پیش کرتا ہے۔پس عملی اور سرگرم سماعت کے بغیر گفتگو کا اصل مقصد ہی فوت ہوجاتا ہے''۔

اطلاعاتی اور علمی انقلابات کی مدد سے عصر حاضر کا مکمل اور صحیح ادراک کیا جا سکتا ہے۔ ''اس مرحلہ سے گذرنے کے بعد ''تہذیبوں کے درمیان گفتگو'' کے مکمل اور حقیقی مفہوم تک بڑی آسانی سے رسائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے مختلف اہم نکات کی طرف خصوصی توجہ لازمی ہے۔ ان میں ایک اہم بات ایک عظیم سیاست داں اور ایک ماہر فنکار کے درمیان تعلقات کا ادراک ہے اور دوسری اہم بات علم اخلاق اور علم سیاست کے درمیان رابطہ و تعلق کا علم بھی ضروری ہے۔ اس کے بعد سیاسی ماہروں اور نامور فنکاروں کے درمیان تعلقات کی نوعیت کا جاننا ضروری ہے۔ دونوں جماعتوں کے درمیان اختلاف کا وجود ایک فطری امر ہے کیونکہ دونوں کا انسانی کوشش کے مختلف شعبوں سے سروکار ہوتا ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے ان دونوں کو کیا چیز نزدیک لا سکتی ہے اور کن پہلوؤں سے ان دونوں کا مقابلہ اور موازنہ ممکن ہے۔ اگر ہم سیاست کی سادہ و جامع تعریف کو نظر انداز کرتے ہوئے سیاسی تعلقات کے شعبہ میں بعض عمدہ سفارتی طریقۂ کار کا استعمال کریں تو یہ بذات خود ہنر ہے اور اس طرح ہم ایک ماہر فنکار اور سیاست داں کے درمیان مزید گہرے تعلقات کا ادراک بڑی آسانی سے کر سکتے ہیں۔ اس خیال کے لئے فلسفۂ فن کی مختلف تعریفیں موجود ہیں اور ہم ان میں کسی ایک تعریف کا انتخاب کر سکتے ہیں لیکن ہم اس حقیقت کو ہرگز نظر انداز نہیں کر سکتے کہ ایک فنکار میں یہ صلاحیت پائی جاتی ہے کہ وہ ''دور حاضر'' میں زندگی بسر کرتے ہوئے اس حاضر کو ''ابدیت'' میں بھی تبدیل کر سکتا ہے۔ اس ابدیت کی تخلیق کب اور کس وقت کے تصور کے ساتھ

فنکار اپنے فن پارہ کی تخلیق کا کام انجام دیتا ہے اور جماعت حاضرین کے رکن کی حیثیت سے موجودہ زمانہ میں اس تخلیق کو دیکھ کر ہم خوش ہو جاتے ہیں اسی صفت کو فنکار کی جادوئی صفت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور صرف عظیم فنکار ہی اس مرتبہ کو حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس طرح ایک فن پارہ کی تاریخی تقدیر ابدیت اور ہمیشگی کے رنگ میں رنگ دی جاتی ہے اور ہم اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ قوموں کی تاریخی تقدیر عظیم ماہرین سیاست کے ذریعہ خاص موقعوں پر ہی لکھی جاتی ہے''۔

ہندوستان اور ایران کے باہمی تعلقات صدیوں پرانے ہیں۔ ہم دونوں بڑی آسانی کے ساتھ ''قوموں اور تہذیبوں کے درمیان گفتگو'' کے ذریعہ جہالت کے کندھوں پر سوار دہشت گردی کے بڑھتے ہوئے مظالم کی روک تھام کر سکتے ہیں۔ صدر محمد خاتمی کی یہ کتاب انکی فکری راہ وروش، سوجھ بوجھ اور انکے شعور اور فلسفہ کو سمجھنے میں بڑی مفید اور کارآمد ثابت ہوگی۔

اندر کمار گجرال

(اندر کمار گجرال)

۱۵ر جنوری ۲۰۰۳ء

پہلا باب

تمدنوں کے درمیان گفتگو

اور

دنیائے اسلام

تمدنوں کے درمیان گفتگواور دنیائے اسلام

۲۰۰۱ء جس کو دنیا نے ''تمدنوں کے درمیان گفتگو کا سال'' قرار دیا ہے، یقیناً بہت ہی اہم اور قابل ذکر پیغامات پر مبنی ہے۔ شاید دنیا میں معدودے چند ہی ایسے موضوعات ہونگے جن کو عالمی مقبولیت حاصل رہی ہو۔ بہر حال اس موضوع پر گفتگواور غور وفکر کے لئے اس کا خلاصہ حاضر خدمت ہے۔

ا۔ اس تجویز کی فوری تائید اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عالم انسانیت کو گفتگواور افہام وتفہیم کی بے حد ضرورت رہی ہے۔

۲۔ یہ تصور، اس کا خاکہ اور اس کی منظوری اس وقت عمل میں آئی جب ایک صدی کا خاتمہ ہو رہا تھا۔ ایسی صدی جو جنگ، افراتفری، غصب، امتیازی سلوک اور دہشت وخوف سے بھری ہوئی تھی۔ خوش قسمتی سے اس طرح کے الجھاؤں اور جنگوں میں دنیائے اسلام کا کوئی رول نہیں رہا بلکہ زیادہ تر موقعوں پر دنیائے اسلام جنگ اور جارحیت کا شکار ہوئی ہے۔ موجودہ ملال انگیز صورتحال کے مقابلہ میں دونوں عظیم جنگیں ہولناک ترین اور خونیں ترین ثابت ہوئی ہیں، یہ دونوں جنگیں مغرب میں اہل مغرب نے ہی لڑی ہیں، تمام دنیا میں حقوق کی خلاف ورزیاں بھی دنیائے اسلام کے باہر ہی کے درمیان ہوئی ہیں۔ ایشیا، افریقہ اور جنوبی امریکہ کے براعظموں میں انسانی حقوق کو پامال کیا گیا اور فلسطینی عوام کو خصوصی وحشیانہ مظالم کا شکار بنایا گیا۔ یہ عدم مساوات اور نابرابری ان غیر مسلم ممالک پر مسلط کر دی گئی جو صنعتی اور ترقی یافتہ ملکوں

حلقوں کے مفکرین اور اہل علم کئی نسلوں سے اسکی تعمیر وتشکیل میں سرگرم تھے۔ کئی صدیوں کی ایجاد اور نئے تجربوں کی روایت ایک سماجی اور سیاسی مضبوط نظام میں بدل گئی جسکا عنوان اصلی اصلاح ہے اور جسکی قدریں بہت گہری کھائی میں پڑی ہوئی تھیں۔ اسکی سیاسی اور فلسفیانہ نکتۂ نظر کی رسائی سامعین کی عالمی جماعت تک رہی ہے اور اس کے نظام کو لائق ماہرین اور سائنسدانوں کی حمایت حاصل رہی ہے۔

ہمارا مخالف بھاری اور غیر معمولی اقتصادی، سیاسی اور فوجی طاقت کا حامل تھا جس کا پیچیدہ اور تباہ کن چہرہ ماضی میں ہم دیکھ چکے ہیں۔ لیکن اس سے ہم لوگ خوف زدہ نہیں ہوئے کیونکہ دور ماضی میں دنیا کے عظیم انقلابات طاقتور دانشمندانہ بنیادوں پر قائم سیاسی نظاموں کا ڈٹ کر مقابلہ کر چکے ہیں۔ ان نظاموں کو بدلنے میں ان نظاموں کو بدلنے میں کامیابی حاصل کر چکے ہیں۔ ہم اس بات کے مدعی ہیں کہ ہمارا انقلاب عظیم ہے۔ پھر مخالفین کی طاقت اس عظیم انقلاب پر کیسے قابو پاسکتی ہے۔

یہ پروپگنڈہ ہمارے لئے وبال جان بن گیا ہے کہ مغرب کا دانشمندانہ اخلاقی اور سیاسی نظام نہایت آسان اور انسانی فطرت کے عین مطابق ہے اور لوگ خود بخود اس کی طرف راغب ہوتے چلے جارہے ہیں۔ جدید فکر اور تمدن کے طرفدار اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کا فکر ونظر کا مرکزی نکتہ ہے ''آزادی'' اور اس دعوے کو ہمیں بھی سنجیدگی سے لینا چاہیئے۔ خاص طور پر ایسے وقت میں جب کمیونزم کی موت کے ساتھ ایک اشتراکی فکر فنا ہو چکی ہے۔ سوویت کمیونزم کی موت کا مطلب یہ نکالا جا رہا ہے کہ فقط مغربی نظریات پر مبنی آزادی کا تصور ہی موجودہ حالات کا مقابلہ کرسکتا

ہے۔

اسلامی انقلاب کے مخالفین کا سارا دارومدار آزادی کے اصول پر ہے جس سے وہ بھرپور توانائی حاصل کرتے ہیں کیونکہ آزادی انسان کی ایک مرکزی، اور فطری منزل ہے۔ جب آزادی کا یہ مطلب بیان کیا جاتا ہے کہ لوگوں کو سب کچھ ان کی خواہش کے مطابق کرنے کی اجازت دی جائے اور آزادی کی تعریف انسان کی پابندیوں سے آزاد رہنے والی مضبوط خواہش کے عین مطابق ہے۔ لیکن عمل میں لامحدود آزادی ممکن ہی نہیں اور آزادی جسطرح سے مغرب اس کی تعریف کرتا ہے وہ ایک لائنس کے ذریعہ ہی ممکن ہے جس کے بموجب دوسروں کے حقوق کو غصب کرنے کی آزادی مل جاتی ہے۔

پس آزادی کا معیار انسان کی فکر اس کی لامحدود خواہش ہے اور اس کا مطلب ہوا کہ لوگوں کی اکثریت یہ فیصلہ کیا کرے کہ آزادی کی حدود کیا ہیں تا کہ وہ اسی بنیاد پر قانون بنائے۔ نئی اقدار کے طرفداروں کا یقین ہے کہ لوگوں کے راستہ میں ایسی کوئی بھی رکاوٹ نہ آنی چاہیے جس کیوجہ سے ان کو جو کچھ وہ کرنا چاہتے ہیں اس میں مشکل پیش آتی ہو لیکن یہ بات اسی وقت ممکن ہے جب تک کہ اسکا ٹکراؤ دوسروں کی خواہشات سے نہ ہو۔ اگرچہ اسکو انسانوں کی بنائی ہوئی پابندیوں کا ایک سلسلہ اپنالیا جائے۔ یہ سسٹم عمومی طور پر انسان کی بنیادی ضرورتوں اور جبلتوں کے عین مطابق ہے جنکو ہم سب جانتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ تمام جسمانی دنیاوی رجحانات اور موجودہ مغربی نظام انسانی زندگی کے مضبوط محرکات کی تشفی کرتا ہے۔ کوئی کام اور کسی

بھی طرح کی تعلیم ان رجحانات کو اپنانے کے لئے ضروری نہیں ہے کیونکہ یہ نظام تسلی بخش، جاذب اور دلکش ہے۔۔

اس کے برعکس ہمارے انقلاب نے لوگوں کو اعلیٰ اقدار کی طرف دعوت دی ہے جن کے حصول میں بڑی طاقت غیر معمولی، کوشش اور کام کی ضرورت ہے۔ ہمارا نظام ایثار، ایمانداری اور ایمان پر منحصر ہے جو انسان کی فطرت میں پیدائشی طور پر نہیں ہے۔اگرچہ انسانوں میں اسکو حاصل کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ان کو حاصل کرنے کے لئے بہت سی مشکلات پر قابو حاصل پڑتا ہے اور بہت سی اخلاقی ذمہ داریاں قبول کرنی پڑتی ہیں جسکے لئے بہت محنت کی ضرورت ہے۔

ہمارے انقلاب کے مخالفین نے جن کے پاس اقتصادی، سیاسی، فوجی، سائنسی اور تکنیکی توانائی موجود تھی، اقدار کا ایک ایسا مجموعہ پیش کیا جو انسان کی بنیادی ضرورتوں اور رجحانات سے مطابقت رکھتا تھا، یہ اس نظام کو ایسا پیش کرتا ہے جیسے یہ اخلاقی یوٹوپیائی کا حامل ہے۔

مغرب کا دعوٰی ہے کہ نہ صرف وہ انسانوں کو ان کے اعمال اور ان کی جبلی خواہش کے مطابق پابندی سے آزادی دیتا ہے بلکہ اس طرح کی اخلاقی زندگی دوسرے سب نظاموں سے بہتر ہے کیونکہ انسانی زندگی کا بنیادی مقصد یعنی آزادی کی کی خواہش کی تکمیل ہو سکتی ہے۔

سچے انسان کسی اور چیز کے مقابلے میں آزادی کی جانب زیادہ توجہ کرتے ہیں اور دلائل وشواہد کی روشنی میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ لوگوں نے آزادی حاصل

کرنے کے لئے جتنی قربانیاں پیش کی ہیں اتنی زیادہ قربانیاں کسی اور مقصد کو حاصل کرنے کے لئے نہیں دیں۔ آج لوگوں کو ایسا نظام فراہم گیا ہے جس میں وہ اپنی مرضی کے مطابق کھانے پینے، لباس پہننے اپنی مرضی کے مطابق اظہار خیال کے لئے آزاد ہیں۔ اور اسکے ساتھ ساتھ آزادی فکر بھی حاصل ہے۔ اسی طرح ایسے نظام میں زندگی کا مقصد طاقت اور خوشحالی ہے لیکن یہ دونوں ہی انسانی زندگی کے عظیم و مبارک ترین مقصد، جس کا نام آزادی ہے، کو حاصل کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ مغرب نے انسان کی بنیادی اور طاقتور خواہشات کو اس کی حیثیت مضبوط کرنے میں استعمال کیا ہے لیکن یہ بہت ہی گمراہ کن ہے کیونکہ جو کچھ وہ دعویٰ کر رہا ہے مغرب سچی آزادی حاصل کرنے سے بہت دور ہے۔ ہم ایک ایسا نظام چاہتے ہیں جسکی بنیاد ایثار اور اعلیٰ اخلاقی معیار پر قائم ہو جو مسلسل کوشش اور اخلاقی و روحانی عظمت و بلندی اور ہمت و حوصلے کے ذریعہ ہی حاصل کی جاسکتی ہے۔ صحیح معنوں میں یہی سچی آزادی ہے لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ لوگوں کو اسکے بارے میں بتایا جائے۔

ہمارے اور ہمارے مخالفین کے درمیان دشمنی کی آگ کو ہوا دی دیجانے کیوجہ طاقت عالمی سطح پر برقی وسائل ارسال و ابلاغ کی رسائی ہے۔ ہمارے عہد کا ہر شخص بغیر زیادہ زحمت کے دنیا کے گوشہ گوشہ سے جڑا ہوا ہے۔ ماضی میں معاشروں کے درمیان جو سرحدیں موجود تھیں، اب ٹیکنولوجی کے ارسال اور ترسیل کے ذرائع سے غائب ہوگئی ہیں اور اب وہ فوری طور پر ہر خبر اور اطلاع کو تمام براعظموں میں منتقل کردیتے ہیں۔ ہمارے مخالفین کے پاس یہ اہم وسائل موجود ہیں جس میں پیچیدہ

تکنیکی علم کی بدولت دنیا کی تمام قوموں کو تصویر اور آواز منتقل کرتے رہتے ہیں۔ جسکو بہت ہی اعلیٰ پیچیدہ اور موثر علمی و تکنیکی طریقوں سے کام لیتے ہوئے آواز اور مناظر جیسے روابطہ عامہ کے وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے رضا مندی کی تولید میں سرگرم نظر آتے ہیں دوسروں کی طرز زندگی اور ان کے افکار پر تسلط حاصل ہو جائے۔

ہم جس زمانہ میں زندگی بسر کر رہے ہیں اس میں کسی فرد واحد کو بھی دنیا میں رونما ہونے والے حالات سے ناواقف نہیں رکھا جا سکتا ہے۔ دنیا میں کوئی کہیں بھی ہو ہر جگہ عالمی حوادث کے سلسلہ میں لازمی اطلاعات کی بھر مار اور اس میں بڑی طاقتوں کے نظریات کی آمیزش دکھائی دیتی ہے۔

ہمارے مخالفین ایسی کسی تحریک یا ایسے معاشرہ کو برداشت نہیں کرتے جو ان سے اختلاف رکھتا ہے اور وہ آزادانہ تحریک کو شروع میں ہی کچل دیتے ہیں۔ مغرب صرف اپنے مفاد کے بارے میں سوچتا ہے اور اگر کچھ لوگ ان کی اقدار سے روگردانی کرتے ہیں اور ان کے منافع کیلئے کام نہیں کرتے تو وہ اپنی پوری طاقت اور توجہ اس پر لگا دیتے ہیں تاکہ اس کو اپنا غلام بنالیں یا اسے صفحہ ہستی سے مٹا دیں اور خاص طور سے یہ ہی وجہ ہے کہ ہمارے انقلاب نے ابتدائی مرحلہ میں ہی سازش کی ان لہروں اور ان دباؤں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

ہمارے انقلاب کو جو بیرونی مشکلات پیش آئیں انکی وضاحت ضروری ہے لیکن ہمیں اپنے اندرونی مسائل کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔

درحقیقت سیاسی اور سماجی شعبے کے عملی مطالبات اور تقاضوں سے اسلام کی

علیحدگی وجدائی ہماری سب سے بڑی پریشانیوں میں ایک ہے۔ سردست ہمارا اسلامی انقلاب جب دنیا اور دینوی حقائق کو نگاہ میں رکھتے ہوئے انسان کی انفرادی اور سماجی زندگی کے لئے نئے نمونوں کی تشکیل کرنا چاہتے ہیں تو اسلامی معاشروں کو چلانے اور انسانی تعلقات کو اسلامی نظریوں کے دائرہ میں لانے کے لئے ہم لوگوں کو اپنی صلاحیت میں کمی کا احساس ہوتا ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے ہمارے پاس کوئی نظم نہیں ہے کیونکہ اسلامی فکر صدیوں سے مصنوعی طور پر جلاوطن کردی گئی تھی اور اسلام کو حکومت کرنیکی اور سماجی تعلقات کو اسلامی راہ روش پر پر چلانے کی اجازت ہی نہیں دی گئی تھی اسکے برخلاف معاشرہ کی لگام یا تو اسلام دشمن طاقتوں کے ہاتھ میں رہی یا ایسے گروہ کے ہاتھ میں جس نے اسلام کو اپنی سرفرازی اور پروپیگنڈہ کیلئے استعمال کیا تاکہ ان کے اختیار اور اقتدار کو قانونی شکل دی جاسکے۔

اس لمبی مدت کے دوران حقیقی اسلام معاشرہ پر حاکم اس نظام کی خرابی اور فرسودگی کے خلاف سرگرم مخالف طاقت بن کررہ گیا جو اسلام کے نام پر حکومت کررہا تھا۔ آج ہمارا انقلاب ایک ایسے نظام کو وجود میں لانے کی کوشش کررہا ہے جو صحیح اسلام ہو۔ اب بھی عصر حاضر کے عملی معاملات ومسائل کو حل کرنے کیلئے کی جانی والے کوشش کے دوران حقیقی اسلام پر مبنی نظریہ کو طرح طرح کی خرابیوں اور کمیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ہم لوگ بڑے خوش نصیب ہیں کہ ہمارے حوصلہ مند مفکرین اور مذہبی علماء کی لگاتار کوشش جدوجہد اور ہماری دینی قیادت نے اصل اسلام کو سیاسی تغیرات کا شکار

نہیں ہونے دیا انہوں نے اسلامی علم کو نئی نسلوں میں منتقل کر دیا اور اسکو برباد ہونے سے بچالیا۔

اسلامی فکر نے وقت، زمان و مکان اور مادی حقیقت سے وابستہ امور و معاملات میں غنی اسلامی نظریات کو کھوج نکالا۔ اور ان مسائل پر ایسی روشنی ڈالی ساری دنیا اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔ اسلامی عرفان انسانی تاریخ میں منفرد اور اکیلا ہے۔ وہ مافوق علم جس کا مقابلہ دوسرے نظاموں سے کیا جائے تو عرفان بہترین طریقہ پر مافوق فطرت چیزوں کو مخاطب کرنیکے لئے پوری طور پر آمادہ ہے۔ لیکن آج ہم اسلام کو عملی جامہ پہناتے ہوئے اسکی تعلیمات کو مادی، سماجی اور سیاسی دنیا میں بروئے کار لاتے ہیں تو ہم لوگوں کو دانشوروں کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ جس کا علاج صرف معتبر اسلامی مآخذ و منابع، آئین و اصول اور کردار و عمل پر مکمل بھروسہ و اعتماد کے ذریعہ ہی کیا جاسکتا ہے۔

ہمارے اسلامی انقلاب کے خیالی تصور کو اچھی طرح سے ان نعروں میں واضح کر دیا گیا ہے جو انقلاب کے ابتدائی دور میں ہمارے نظریہ کی تعریف میں لگائے جاتے تھے۔ یہ نعرے یا تو براہ راست لوگوں کے ذہن کی پیداوار تھے یا اوائل انقلاب میں روشن فکر اور باخبر رہنماؤں نے ان کی تخلیق کی تھی اور بعد میں عوام نے ان کو اپنالیا۔

ممکن ہے سردست ہماری منزل مقصود ظاہری طور پر اس وقت ہماری رسائی سے باہر دکھائی دیتی ہو۔ دنیا کا کوئی بھی نظام اتنا ہی مضبوط اور دیرپا ہوتا ہے جتنی

اس کو حقیقی اور عملی تائید حاصل ہوتی ہے۔ یہ محض خیالوں کی دنیا میں باقی نہیں رہ سکتی ہے۔ ایک غیر معیاری دنیا میں معیار کی تلاش کرتے وقت ہمیں نظم میں توازن اور معاشرہ کی فلاح و بہبود پر پوری نظر رکھنی چاہیئے۔ اگر ہمارے معاشرہ کا آہنگ اس زمانے کے فطری تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر ہے جس میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں تو ہمیں بہرحال مصائب و مشکلات اور پیچیدگیوں کا سامنا کرنا ہوگا۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں تمام رکاوٹوں کو دور کرتے ہوئے ایک ایسے عملی و مناسب نظام کو ترجیح دینا لازمی ہوجاتا ہے جو ہمارے انقلاب کی ضرورتوں کو پوری کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

ہمارے معاشرہ کا تانا بانا بہت ساری خرابیوں سے گھرا ہوا ہے۔ اقتصادی۔ سیاسی دقتیں اپنا سر اٹھا رہی ہیں اور ابھی تک ہم مغرب پسندی (مغربیت) سے وابستہ اپنی ملی شناخت کی بیماری میں مبتلا ہیں جسکی وجہ سے نہ ہم اپنے اساس پر باقی رہ گئے ہیں اور نہ ہی پوری طرح مغربی ہو سکے ہیں۔ اگر اس مسئلہ کی جڑ کو کہیں اور تلاش کرنا ہے تو یہ تلاش لازمی ہے تاکہ اس بیماری کو موثر اور عملی طور پر جڑ سے اکھاڑا جاسکے اور ہم لوگ دوسری مشکلات پر قابو پانے میں جلدی کامیاب ہوجائیں۔

عملی معاملات میں ہم بہت زیادہ فقہہ پر انحصار کیا ہے تاکہ وہ انفرادی اور سماجی امور و معاملات میں احکامات جاری کرے۔ اس انحصار کیوجہ سے ہم لوگوں کو اہم بدعنوانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ انقلاب کے مطالبات کو پورا کرنے کے لئے ہمیں اپنی فقہی کاوشوں کو فروغ دینا ہوگا تاکہ عصر حاضر کی عملی ضرورتوں کو پورا کرنے میں کوئی دشواری نہ ہو، یہاں ہم اسلامی انقلاب

کے عظیم رہنما امام خمینی کی طرف رجوع کر سکتے ہیں جو ایک عظیم رہنما گرانقدر فلسفی، صاحب بصیرت فقیہہ اور عارف تھے ہم ان کی طرف اسلئے دیکھتے ہیں کہ وہ اس خلاء اور خرابی کو دور کریں تا کہ ہم اپنی منزل مقصود کو حاصل کر سکیں۔

''ہم اسلامی قوانین کے عمل آوری کو وجود میں لائیں اور مغرب کی فریب کن چالوں سے بچیں اور مشرق کے جارحانہ اور دنیا پر غلبہ حاصل کرنے کی ڈپلومیسی سے گریز کریں۔ واضح رہے جب تک فقہہ صرف کتابوں میں اور دیندار حضرات کے ذہنوں میں موجود ہے تو دنیا کے ہڑپ کرنیوالوں کو اس سے کوئی نقصان پہونچنے والا نہیں ہے۔ جب تک دینی رہنما ہر میدان میں سرگرم عمل نہیں ہوتے اس وقت تک ان کو یہ احساس نہیں ہوگا کہ صرف مذہبی اقتدار اور علم ہی کافی نہیں ہے۔ مذہبی تعلیم کے مراکز اور دینی رہنماؤں کو وقت کا شعور ہونا چاہئے اور موجودہ دور کی نبض پر ان کا ہاتھ ہونا چاہیئے تا کہ وہ مستقبل کی ضرورتوں کو جان سکیں۔ ہمیشہ واقعات سے چند قدم آگے رہتے ہوئے انھیں مختلف عصری مسائل کے مئوثر جواب معلوم ہونے چاہئیں۔ اپنے معاشرہ کو چلانے کے لئے آئندہ وقت میں ہمارے موجودہ طریقوں میں تبدیلی آسکتی ہے۔ اور انسانی معاشرہ ان مسائل کا استعمال کر سکتا ہے جو آج اسلام کے سامنے موجود ہیں''۔ ۱☆

☆ روح اللہ خمینی، صحیفۂ نور تہران، مرکز مدارک انقلاب اسلامی (۱۹۹۰۔جلد ۲۱ ص ۱۰۰)

ہم سب اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ امام کا انتقال مذہبی، عرفانی آگہی کے عروج کے زمانے میں ہوا ہے۔ انقلاب حق اور انصاف مبنی اسلامی انقلاب نے ان کی رہبری اور رہنمائی میں غیر معمولی وترقی حاصل کی۔ بقول امام خمینی عصری تقاضوں سے بے خبر اور صدیوں پرانے تصورات کے ساتھ زندگی بسر کرنے والا عالم دین معاشرہ کو آج کی پریشانیوں سے نجات دلانے میں کامیاب نہ ہوگا چاہے اس کے ارادے کتنے ہی نیک ہوں۔ آج کے تقاضوں سے باخبر رہتے ہوئے عالم دین کا ہاتھ مستقبل کی فکر وضرورت کی نبض پر ہونا چاہے۔ ایسا ہی شخص حوادث کے رحم وکرم پر زندگی بسر کرنے کے بجائے وقت کے دھارے کا منہ موڑ سکتا ہے۔ امام خمینی کا ارشاد ہے:

''اسلامی حکومت میں ہمیشہ نظر ثانی اور تبدیلی کی گنجائش ہونی چاہیئے۔ ہمارے انقلابی نظام کے تقاضے ہیں کہ مختلف حتیٰ مخالفانہ نظریات کو بھی پیش کرنے دیا جائے۔ کسی کو ان نظریات پر پابندی لگانے کا حق نہیں ہے۔ یہ سمجھنا بہت ضروری اور اہم ہے کہ معاشرہ کے مطالبات اور حکمرانی جیسا کہ اسلامی حکومت مسلمانوں کے مفاد میں حکمت عملی بنا سکتی ہے طریقہ کار اور عمل میں اتحاد کی بنیادی اہمیت ہے، یہاں پر ہمارے روایتی مذہبی رہبر جو ہمارے مذہبی حلقوں میں رہتے ہیں ان کی موجودگی کافی نہ ہوگی ۱☆

....

☆۱۔ ایضاً۔ ص ۴۷

کی فہرست میں نہیں تھے بہر حال ان تمام حالات کے ساتھ ہی ساتھ خونریزی قتل و غارتگری اور شدت پسندی لوٹ کھسوٹ سے بھری ہوئی اس صدی کے اختتام اور تیسرے عیسوی ہزارہ کے آغاز کے موقع پر گفتگو اور افہام و تفہیم کے سایہ میں دنیاوی بشریت کے لئے ایک روشن اور خوش آئند مستقبل کی وکالت کی جارہی ہے۔

۳۔ اس میں اہم ترین بات یہ ہے کہ جس تصور کو تمام دنیا نے قبول کیا اس کا خاکہ مسلمانوں نے ہی بنایا تھا۔ یہ گذشتہ صدی کے آخری پچاس سالوں کے دوران مسلم اقوام اور دنیائے اسلام کی خود اعتمادی، خود اعتقادی اور خود انحصاری کا ایک بین ثبوت ہے۔ ''تمدنوں کے درمیان گفتگو'' کا مجوزہ محرک بھی خود ایک قدیم اور اہم تہذیب وتمدن کا وارث ہے۔ وہ اس سے بخوبی آگاہ ہے کہ انسانوں کے تعلقات کا انحصار طاقت اور زور آوری پر نہیں بلکہ تعقل پسندی اور گفتگو پر ہی مبنی ہے۔ ''تمدنوں کے درمیان گفتگو'' جیسے اہم موضوع پر بات چیت کرنے والا تعقل پسندی کو اہمیت دیتا ہے اور اپنی زندگی تعقل پسندی کی بنیاد پر بسر کرتا ہے جو درحقیقت عقل وفہم کی بنیاد بھی ہے۔ ہم تعقل پسندی اور گفتگو پر ہی یقین رکھتے ہیں۔ مذہب اور تاریخ نے ہمیں یہی سبق سکھایا ہے۔ یہ مسلمان ہی تو تھے جنہوں نے اہل مغرب کو تاریخ، فلسفہ اور مدنیت وشہریت سے آشنا کیا۔ یونانی سائنس، فلسفہ اور عقلیت کا یورپین اقوام میں انتقال مسلمانوں سے ان کی ملاقات اور ان کے ساتھ تعلقات کی بدولت ہوا۔ اہل یورپ نے تحمل اور برداشت کا سبق ہم سے سیکھا۔ لیکن یہ کتنی مضحکہ خیز اور طنز آمیز بات ہے کہ آج وہ اخلاقی تعلیم میں تحمل اور برداشت کا درس ہمیں دے رہے ہیں۔ مغرب کا عظیم

مذہبی قیادت کا اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ وہ فیصلہ کرتے وقت اور زمان ومکان کو نظر میں رکھے۔ حکومت نے اپنی عملی فلسفہ کی وضاحت کر دی ہے کہ کیسے مذہبی بے ادبی سے معاملہ کیا جائے اور داخلی اور خارجی مشکلات کے ساتھ کیسے پیش آیا جائے۔ یہ مسائل صرف نظریاتی طریقہ سے نہیں طے ہونگے بلکہ ہم کو ایک اندھی گلی میں داخل کر دینگے اور آئینی قوانین کو توڑ دیا جائیگا۔ لیکن آپ کو اب یقینی بنانا ہے کہ مذہبی گڑبڑ نہ واقع ہو اور میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ ایسا دن نہ آئے۔ آپ سب کو اپنی توجہ اس کوشش پر لگانی چاہئے کہ جب فوجی سماجی اور سیاسی مسائل سے مقابلہ آرائی ہو رہی ہو ہو تو اسلام کی عملی افادیت میں ذرہ برابر کمی واقع نہ ہو'' ☆۱

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

''جہاں تک مذہبی مدارس میں تحقیق اور طریقہ تعلیم کا سوال ہے میرا خیال ہے کہ روایتی فقہہ یا ادھر اُدھر بھٹکنا نا مناسب ہوگا۔ مذہبی رہنما ہی ان مسائل میں صحیح ہو سکتے ہیں لیکن اسکا مطلب یہ بھی نہیں کہ اسلامی فقہہ متحرک نہیں ہے۔ زمان ومکان اسکے دو فیصلہ کن عامل ہیں'' ☆۲

....

☆۱۔ صحیفۂ نور ایضاً۔ ص ۶۱

☆۲۔ صحیفۂ نور جلد ۲۱۔ ص ۹۸

ہمیں اس میں شک نہیں کرنا چاہیئے کہ بہت ساری آرااور نظریات جنہوں نے ہماری یہاں تک رہبری کی ہے، وہ ہمارے سماجی معاملات کے انتظام میں کافی نہیں ہیں اس سسلے میں ایک نئے نظریہ اور فہم کا حصول لازمی ہے۔ موجودہ مذہبی رہنماؤں پر بھروسہ کرنا ضروری ہے لیکن کافی نہیں ہے۔

اگر یہ مرکزی پریشانی دوسری باتوں سے دب جاتی ہے تو معاشرہ مسائل کے خاطرخواہ حل کو حاصل کرنے میں پیچھے رہ جاتا ہے۔ یہ مسائل بہت ہی سنجیدہ ہیں لیکن ہم مستقبل کے بارے میں ناامید نہیں ہوسکتے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اہم ہمارے نوجوان دانشوروں کو سماجی سطح پر اپنی عملی اور پر امید موجودگی جاری رکھنی چاہیئے۔

مرحوم ومغفور امام ہمارے انقلاب کے ناقابل تغیر نعمت تھے اور اسلامی جمہوریت بھی ان ہی کی مرحون منت ہے۔ ہمارے زمانے میں انہوں نے خدا کے اس دین کا احیاء کیا۔ دوسرے مذاہب سے انکا اختلاف یہ تھا کہ انہوں نے اسلامی حکومت کی تشکیل میں مرکزی رہنما یانہ رول ادا کیا۔ وہ اس بات سے باخبر تھے کہ اگر مذہبی رہنما، مفکرین ودانشور عملی مسائل سے دوچار نہ ہوئے تو وہ اس کا حل تلاش نہ کریں گے۔ لیکن جب اسلام سیاسی منظرنامہ پر آیا ایک حکومت قائم کی اور اقتدار اپنے ہاتھ میں لیا تو تمام لوگوں کی منطقی اور عقلی توقعات کو پورا کرنے کا مسئلہ اس کے سامنے آیا۔ اوراس مسئلہ کا حل تلاش کرنے کی ضرورت بھی محسوس ہوئی کیونکہ اس عوامی مسئلہ سے متاثر عوام انقلاب سے اپنی امیدیں وابستہ کئے بیٹھے تھے۔ بہرحال اس

مسئلہ کی شناخت اور موجودگی نئے نظام کو قائم کرنے کے سلسلہ میں بڑا اہم قدم تھا، یہ نظام افکار، اقدار اور مناسب مہارت کے اعتبار سے ہمارے زمانہ کے مطابق تھا جس میں اسلامی قوانین کی چہار دیواری میں رہتے ہوئے انسانی ضروریات کو پورا کرنے کی صلاحیت بدرجہ موجود تھی۔

امام کا عظیم ترین ترکہ اسلامی حکومت کا قیام ہے جو متعدد سازشوں اور بھاری دباؤ کے باوجود باقی رہ گئی ہے۔ مخالفین کو امید تھی کہ امام کے انتقال کے بعد اسلامی جمہوری نظام کا بنیادی ستون گر جائیگا لیکن خداوند تعالیٰ کے فضل سے یہ نہیں ہوا۔ امام کی وفات کے بعد رہبری کا ایک ادارہ بن جانا اور ہم لوگوں کا ان کے بتائے ہوئے انقلابی جدوجہد کے راستہ پر چلنا یہ ایک بڑی امید کا منبع ہے۔

دوسری بڑی امید ہمارے دور میں ہے انسانیت موجودہ کی صورتحال ہمارے اسلامی انقلاب نے پوری اسلامی دنیا اور تمام دنیا کے پسماندہ لوگوں میں ایک طوفان برپا کر دیا ہے۔ پس خیالی خواہشات دنیا کے کمزور و پسماندہ لوگوں کے قلب میں چھپی ہوئی آتشین طاقت ہمارے انقلاب کا پشتوانہ ہیں۔ اگر ہم اس طاقت کو سمجھیں اور اس کو مؤثر انداز میں استعمال کریں تو ہم غیر معمولی اقتصادی و فوجی طاقت اور عالمی سطح پر سیاسی غلبہ کے حامل مخالفین کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اگر ہم اپنے خیالی تصور پر بھروسہ کریں کہ ہمارے انقلاب نے پوری اسلامی دنیا اور دوسرے حصوں کو بیدار کیا ہے۔ اور ہم یہ یقین رکھیں کہ ہمارے انقلاب کے حمایتی کسی بھی قربانی کے لئے تیار ہیں تو پھر کامیابی ہمارے قدم چومے گی۔ ہمارے مستقبل کے لئے یہ انتہائی امید

افزا بات ہے کہ ظاہری اعتبار سے طاقتور ہمارا مخالف بوڑھا ہو چکا ہے اور اپنی عمر کے آخری مرحلہ میں ہے۔ مغربی فکر اور تمدن میں موجودہ بے چینی اس کی قدامت کو دھوکا دے رہی ہے۔

دوبارہ ہمارا اصل مسئلہ بنیادی اور دوطرفہ مخالفت ہے ایک طرف ہمارے انقلاب کی اقدار اور موجودہ زمانہ پر حاوی قدروں کے درمیان موجودہ مخالفت ہے اور دوسری طرف ایک حقیقی مذہبی حکومت کے قیام کے سلسلے میں لازمی اور عملی تجربہ کا فقدان ہے۔ اب آج کی جو دنیا میں حاوی ہے اور دوسری طرف ایک حقیقی مذہبی حکومت کے قائم کرنے کے سلسلے میں ہم اس مسئلہ کا حل کیسے نکالیں تا کہ خدا کی مدد کے سایہ میں یہ انقلاب سخت دھمکیوں سے محفوظ رہے۔

ہم میں سے بناوٹ سے دور رہنے والے سادہ طبیعت لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ مخالفین کی قدروں پر ایسی پابندی لگادی جائے کہ وہ ہمارے عوام تک رسائی نہ حاصل کرسکیں۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ ایک مضبوط حل ہے؟

بہت کم صلاحیت اور نامکمل تصور رکھنے والے کچھ افراد عوام کو اس کام کے لئے آمادہ کر سکتے ہیں کہ وہ ہر اس چیز پر حملہ آور ہو جائیں جو یا تو ان کے بند دماغوں میں نہیں آتی یا ان کی نظر میں اسلام کے خلاف یا انقلاب اور شہداء انقلاب کی میراث کے خلاف ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے معاشرہ میں بہت سے ایسے کیمپ ہیں جو اگرچہ منطق سے دور ہیں لیکن اپنے آپ کو انقلاب اور اسلام کا ستون تصور کرتے ہیں۔ اور اپنے مخالفین پر اسلام اور انقلاب دشمن ہونے کا الزام لگاتے ہیں۔ کیونکہ وہ ہر قیمت پر

اپنے مخالفین کو سیاسی میدان سے باہر کر دینا چاہتے ہیں۔

لیکن سوال یہ پیدو ہوتا ہے کہ وہ کون معیار ہے جس کے ذریعہ یہ طے کیا جا سکے کہ کیا چیز قابل قبول ہے اور کیا چیز نا قابل قبول اور مشکلات اور دشمن کے مقابلہ میں ہمیں کیا طریقہ کار اپنانا چاہئیے؟ کیا ہماری ثقافتی پالیسی پر کچھ سنسر اور پابندیاں لگنی چاہیے؟ کیا ہم اس کے مخالف ہیں؟ کیا بین الاقوامی قوموں سے الگ تھلگ رہنے کی پالیسی آج کے زمانے میں درست ہے؟

اسلام کی عظیم وشاندار تاریخ میں کبھی بھی الگ تھلگ رہنے کو ترجیح دیتے ہوئے رسائی پر پابندی لگانے کو مناسب پالیسی سمجھا گیا ہے؟ بعض ادوار میں اسلام کے نام پر لوگوں پر پابندیاں لگائی گئیں جس نے نا قابل تلافی نقصان پہنچایا لیکن یہ زیادہ دیر تک نہیں چلا اسلام نے مخالفانہ نظریات کا کھلے ہوئے باڑوں کے ساتھ استقبال کیا ہے۔ مذہبی اداروں کے مسلمان مفکروں نے دوسرے نظریات کا مقابلہ بہت اچھے طریقے سے کیا ہے۔ اسلامی تمدن کے اس کھلے ہوئے مزاج نے اس تمدن کو عقل اور فہم کے اعتبار سے مزید بھاری بھر کم بنا دیا ہے۔

اسی طرح سے پابندی آج کے زمانے میں عملی حل نہیں ہے۔ اطلاعات کے جو وسائل ہمارے عوام کے اختیار میں ہیں وہ حکومتی وسائل، منابع تک محدود نہیں ہیں۔ چلئے ہم تسلیم کئے لیتے ہیں کہ ہم ایسی تمام کتابوں کی اشاعت نہیں ہونے دیتے جو خراب اور فاسد عبارتوں کی حامل ہیں، ۔ تمام ایسے اخبارات اور رسالوں پر پابندی عائد کر دی جاتی ہے جسمیں ایسی کوئی بھی چیز چھپی ہو جو ہمارے مزاج و مذاق کے خلاف ہو۔ اور یا ایسی فلموں کی تیاری بھی ہم روک دیتے ہیں جس کو ہم خراب پاتے

ہیں۔ یہ سب افکار اور نظریات جو سرکاری طور پر ممنوع قرار دیدئے جائیں کیا کسی دوسری طرح سے ہمارے لوگوں تک نہ پہنچ جاتے؟

فکر و خیال کی دنیا کی چیز کی خوبی اور خرابی کے بارے میں ضد پر مبنی فیصلہ و عقیدہ اچھی منطق اور حقیقت پسندانہ رویہ کی جگہ لے سکتا ہے۔ یہ سوچنا سادہ لوحی ہے کہ صرف حکومت کے چلائے ہوئے چینل ہی داخلی اور عالمی عوام کے اطلاعات حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ہیں۔ ہم کیسے متحرک اور جستجو کرنے والے ذہنوں کو اس بات سے روک سکتے ہیں کہ وہ اپنی مطلوبہ چیز تک رسائی حاصل نہ کریں؟ ہم ایسے متحرک دماغوں اور باہر کی دنیا کے درمیان ایک دیوار کیسے کھڑی کر سکتے ہیں؟ اطلاعاتی تکنیک کی مسلسل ترقی کا ماحصل ہماری زیادہ تر آبادی کی دسترس میں ہے اور مستقبل میں ان تصورات پر کنٹرول یقیناً غیر حقیقی اور غیر عملی ہوگا۔

یقیناً اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہمارے اسلامی نظام میں لوگوں کی اطلاعات کی دسترس اور رسائی پر کوئی حد یا پابندی نہ لگائی جائے۔ کوئی حد اور پابندی یہ بات بھی غیر حقیقت پسندانہ ہوگی۔ حکومت کی کوئی بھی شکل ہو وہ بغیر پابندی لگائے رہ نہیں سکتی اور بہت زیادہ ترقی یافتہ آزاد جمہوریتیں بھی اس قائدہ سے نیاز نہیں ہیں۔ لیکن ایک ایسا نظام حکومت جو پابندی کو خصوصی حکمت عملی قرار دیتا ہے اس نظام سے یقیناً مختلف ہوتا جو مخصوص اور اہم معاملات کی اصلاح کے مقصد سے کبھی کبھی پابندی عائد کرتا ہے۔ کوئی بھی نظام ہو وہ کسی نہ کسی طرح کی پابندی لگانے پر مجبور ہے بالخصوص ایسے حالات میں۔ جب اسکا پورا وجود اور اسکی حکومت کی بنیاد کو خطرہ لاحق ہو۔ بہر صورت مجموعی اعتبار سے اسلام نے تاریخ میں کبھی بھی اپنے نظام کی بنیاد پابندی اور

سنسر شپ پر نہیں رکھی۔

تنہائی اور گوشہ نشین کو ایک زندہ اور متحرک اسلامی معاشرہ کی ثقافتی حکمت عملی ہر گز نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اسلام بحیثیت ایک ترقی پسند مذہب کے لوگوں کے ضمیر کے اردگرد کسی طرح کی دیوار کھڑی کرنے کا مخالف ہے۔ باوجود اس کے ہماری حکمت عملی یہ ہے کہ لوگوں کو محفوظ اور اعلی سطحی تعلیم دی جائے تا کہ وہ مغرب کی تہذیبی خرابی کو وہ خود روکیں۔ پس خود حفاظتی طاقت کی ایجاد ہی ایک ایسا قابل قبول حل ہے جو آج اور کل دونوں کے لئے مناسب ہو سکتا ہے۔ پس اس ضرورت کے تحت ہم مختلف خیالات کے اظہار کی اجازت دینگے تا کہ معاشرہ میں لوگ ایک دوسرے سے مباحثہ کریں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ جسم کو محفوظ بنانے کے لئے کمزور اور محدود بیماری والے جرثومہ کوئی انجکشن لگائے بغیر جسم کو اس لائق کیسے بنایا جا سکتا ہے کہ وہ دیگر جرثومہ کے شدید اور خطرناک حملوں کا مقابلہ کیسے کر سکتا ہے؟ جسم کی بیماری کے جرثوموں سے مقابلہ کرنے کے لئے یہ طریقہ نہیں ہے کہ جرثوموں کو اسکے نزدیک ہی نہ آنے دیا جائے۔ اسکے برخلاف ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ موجودہ نظام میں جرثومہ کا مقابلہ کرنے کا آلہ موجود ہے۔ سوسائٹی میں بھی اسکے علاوہ کوئی دوسرا طریقہ نہیں ہو سکتا۔ ایک متحرک ترقی پزیر معاشرہ اپنا رابطہ وتعلق مختلف اور کبھی کبھی مخالفوں سے بھی رکھتا ہے۔ کیونکہ ایسے نظریوں سے اپنے دشمن کے مقابلے میں اپنے آپ کو زیادہ طاقتور، جاذب اور مؤثر فکر سے مسلح کر لیتا ہے۔ اور اگر مذہبی اور انقلابی فکر کے منابع یقینی طور پر اپنے انقلابی نظام کو باقی رکھنا چاہتے ہیں تو ان کے لئے کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے سوائے

اسکے کہ وہ معاشرہ میں سنجیدہ مناسب اور مطابقت پذیر فکر کو آنے دیں۔انقلاب کے
آغاز میں ہی امام خمینی نے ناپسندیدہ افکار کو بند کرنے کے خلاف مشورہ دیا جو ہم نے
اس وقت پسند نہیں کیا۔لیکن ہمیں فخر ہے کہ ہمارے انقلاب کا پہلا قدم آزادی کی بنیاد
پر اٹھا۔اور یہ ہمارے انقلاب کا کوئی غیر عمدی نتیجہ نہیں تھا جو ہمارے رہنماؤں کے
ہاتھ سے نکل گیا ہو۔شروع سے یہ اصول اپنایا گیا کہ دوسرے اپنی سوچ کے بارے
میں بتا سکتے ہیں ۔سوائے اسکے کہ وہ کوئی سازش کر رہے ہوں اگرچہ کچھ گروہ جنہوں
نے اسکو استعمال نہ کرنا چاہا اس آزادی کو عقلمندی اور ہوشیاری سے نہیں برتا۔ بلکہ اسکے
مقابلے میں نامناسب طور پر اور خراب طریقہ کو اپنایا۔قصور انہی کا تھا انقلاب کا نہیں۔
معاشرہ کو اسکا بہت نقصان اٹھانا پڑا۔ یہ لوگ آزادی کے غلط طور پر استعمال کرنے
والے تھے۔جنہوں نے فکر کی برتری اور عقل کی بالادستی کو قبول نہیں کیا بلکہ فضا کے کھلے
پن کو خراب کر دیا اور اپنی مطلق العنانی کی خواہشات کو مسلط کرنے کے لئے استعمال
کیا۔انہوں نے یہ نہیں محسوس کیا کہ ایک حکومت جو لوگوں کی رائے اور عقیدوں سے
بنی ہے اور شہیدوں کے خون سے جس کی آبیاری ہوئی دنیا کے لاکھوں بے غرض
چاہنے والے ہر انقلاب دشمن سازش کے خلاف اٹھ کھڑے ہونگے۔قانونی
مخالفت کی محدودیت اسوقت ایک سازش تھی اور آج بھی ہے۔

یہ خیال کہ سازش اصل میں ہے کیا ؟ اسکی وضاحت ضروری ہے ہم سماجی
مسائل کو ایک اہم اور کھلی نظر سے دیکھتے ہیں ورنہ کوئی بھی بند ذہن اور ضدی آدمی
سازش کو بطور عذر کے استعمال کر سکتا ہے تا کہ اسطرح سے اپنے مخالفین کو سیاسی

منظر نامہ سے ہٹانے میں کامیابی حاصل کر سکے۔ بہر حال ہمارے نظام میں محاسبہ اور نظم کی ضرورت ہے۔

بعض گروہوں اور جماعتوں کے بظاہر سطحی وغیر محتاط مگر سیاسی مہارت سے بھر پور خیالات نہ معاشرہ کے مفاد کا خیال رکھتے ہیں اور نہ ہی سازش اور اسکی حدود کو سمجھ سکتے ہیں۔ وگرنہ ہر شخص خود مخالف افکار پر حملہ کر سکتا ہے جبکہ خود اسکا مذاق محدود ہو اور اپنے ملک کے مفاد کو بچانے کی غرض سے انقلاب اور مذہب کو بھی کسی سازش کا شکار نہ ہونے دینا چاہتا ہو۔ پس اپنے بنیادی مسائل کو حل کرنے کے لئے ہمیں اعلیٰ فکر و منطق کی تشکیل کرتے ہوئے اسے معاشرہ میں پیش کرنا چاہئیے۔ اسکے ساتھ ساتھ سوسائیٹی کے تمام مسائل کا پر کشش حل تلاش کرنا چاہیے صرف اس طریقے سے ہم انقلاب کے چاہنے والوں کو کچھ امید دلا سکتے ہیں۔ اور اسکے ساتھ ساتھ کچھ مادی اور روحانی بہتری کر سکتے ہیں ہمیں کوشش کرنی چاہئیے کہ ایک ایسا مضبوط بنیادوں والا نظام بنائیں جو دوسرے طریقوں کے مقابلہ میں ہر طرح کے مقابلہ کی صلاحیت رکھتا ہو اور اپنی فضیلت کو ظاہر بھی کرے۔ یہ اس تحریک نے خود اثبات کو بچایا ہے اور اسلامی فکر اور مذہبی عقائد کے جوہر کو مختلف زمانوں میں اور زیادہ توانا کیا ہے۔

ایک ہم لوگوں جیسا نظام جو اسلام کی یوٹوپیائی نظریاتی تصوارت پر قائم ہے اسے انفرادی آزادیوں پر بہر حال کچھ پابندی لگانی ہے۔ ایک انقلابی، مذہبی نظام قدرتی طور پر ایسی بہت سی چیزوں سے روکے گا جو لوگوں بالخصوص مغرب میں نوجوانوں کی دسترس میں ہیں۔ خاص طور سے مغرب میں نوجوانوں کے جذبات

میں کثرت پائی جاتی ہے چنانچہ ان کی تسلی مغرب میں زیادہ بہتر طریقہ سے ہوتی ہے
اور انکی بشری خواہشات کی تسلی وہاں ہو جاتی ہے جبکہ ایک اسلامی نظام میں جسکے بہت
زیادہ مذہبی قائدے قانون راستہ میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔ ہمیں اپنے معاشرہ کو
زیادہ مضبوط اور پائدار بنانا چاہیے اور اپنے نوجوانوں کو بتانا چاہیے کہ لذت پرستی
کا ایک بہتر راستہ جسمیں انھیں زیادہ لطف و لذت حاصل ہو سکتی ہے۔ احتراز و ایثار
اور ترک ہے۔

تصوراتی فکر کے ذریعہ لوگوں خاص طور سے نوجوانوں کو بھروسہ اور زندہ دلی
سے مالا مال کیا جا سکتا ہے۔ مسلمان نوجوانوں کو یہ عقیدہ رکھنا چاہیے کہ پابندیوں
اور محدودیتوں کے عوض جو ہمارے نظام نے ہم پر لگائیں ہیں ہم لوگوں کو کردار کی
دولت عطا کی ہے اور ہماری زندگیوں کو ایک متعین سمت سے مالا مال کیا ہے جسکے سایہ
میں ہمیں افتخار، عظمت اور امن حاصل ہوتا ہے۔ جذباتی اور ذہنی ضرورتوں کو ضرور
سمجھا جائے تاکہ لوگ مطمئن ہو سکیں اگر وہ اسلام جو ہم پیش کر رہے ہیں ان ضرورتوں
کو پورا کرنے میں ناکام رہا تو ہمارے معاشرہ کی بنیاد کمزور ہو جائے گی۔

انقلاب کے چاہنے والوں کی تصوراتی نظریہ کی تکمیل۔ جو ایران کے اندر اور
باہر موجود ہیں -- ایک اہم ضرورت اور ہماری بقا کی ضمانت ہے۔ اپنی شناخت کو
باقی رکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم دنیا کے ہر فورم میں موجود ہوں اور اسلام اور
ایران کا بہت ہی مئوثر انداز میں بین الاقوامی ٹریبونل اور دوسرے عالمی اجتماعات
میں دفاع کیا جائے۔ جب تک ہم اپنے منفرد تصورات کو باقی نہیں رکھتے ہم ترقی

اسلامی تمدن کا مرہون منت ہے۔ دنیائے اسلام آج بھی ایک عظیم تمدن کی وارث ہے لیکن یقیناً یہ حقیقت بھی پوشیدہ نہیں ہے کہ ہمارے تمدن اور ہماری موجودہ حالت میں بڑا فاصلہ پیدا ہوگیا ہے۔

۴۔ ''تمدنوں کے درمیان گفتگو'' کا مطلب ہی یہ ہے کہ قوموں اور ملکوں میں مساوات اور برابری ہو۔ دوسرے لفظوں میں کوئی شخص دوسرے شخص سے تب ہی بات چیت اور گفتگو کرتا ہے جب اسکو قابل احترام سمجھتا ہے اور اسکو اپنے برابر مانتا ہے۔ سامراجیت اور نو آبادیاتی نظام کے ذریعہ، جو گذشتہ دو تین صدیوں سے دنیا کے بعض حصوں پر حکمراں تھا عوام اور اقوام کو پہلے اور دوسرے درجہ کے شہریوں میں تقسیم کیا گیا۔ یعنی بعض اقوام کو جبلی طور پر حکومت کرنے کا حق حاصل تھا اور بعض دیگر قوموں کو حکمراں طبقے کی اطاعت بہر حال کرنی تھی۔ جنگ کی شروعات یہیں سے ہوتی ہے جب ایک فریق طاقت کے ذریعہ اپنے لئے زیادہ حقوق کا تعین کر لیتا ہے تو وہ ہر حال میں اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے چاہے اسے جنگ ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ اس طرح کی جنگ بے انصافی اور امتیازی سلوک کا نتیجہ ہوتی ہے۔ لیکن جب ''تمدنوں کے درمیان گفتگو'' کی تجویز رکھی جاتی ہے اور وہ منظور بھی ہو جاتی ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ قوموں کے درمیان مساوات اور برابری کی تجویز اقوام کی پسندیدہ تجویز ہے اور یہ انسانیت کی بہت بڑی کامیابی ہے۔

۵۔ موجودہ دور میں ہم مسلمان اپنے بہت سے مشترک عناصر کو سامنے رکھتے ہوئے اس بات کی مخلصانہ کوشش کریں کہ ہمارے آپسی اختلافات کم سے کم ہو جائیں

نہیں کر سکتے اور اپنے وزن کو بھی بین الاقوامی سطح پر محسوس نہیں کرا سکتے جبکہ اسکے قائدے ہمارے مخالفین بنا رہے ہوں۔ جب تک ہم اپنی منفرد تصورات کو باقی نہیں رکھتے۔ ایسا کیوں تھا کہ ہماری عراق سے آٹھ سالہ جنگ کے دوران ہمارے تہذیبی مسائل کا دباؤ ہم پر کم تھا، کیونکہ ایک عوامی لہر انقلابی نوجوانوں کی اصلی صفوں میں موجود تھی اور لوگوں نے انکو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ کیسے ملک اور انقلاب کا دفاع کرر ہے ہیں۔ اس عملی موجودگی نے لوگوں کو فخر سے بھر دیا۔ ہمارے نوجوانوں نے محسوس کیا کہ ان کی زندگیوں کو نئے معنی مل گئے ہیں انھوں نے ایک روحانی اعلی مرتبہ حاصل کیا ہو۔ اب جب کہ جنگ ختم ہوگئی ہے تو اس کی جگہ کون لے گا؟ ایک مؤثر حل یہ ہے کہ جوان نسل کے حصہ لینے کے لئے زمین تیار کی جائے جس سے وہ اپنی صلاحیتوں کو بڑھا سکیں اور ان کو تخلیقی طور پر استعمال کرسکیں اگر نوجوان نسل اپنے آپ کو متحرک اور سوسائٹی میں مفید نہیں پاتی تو یہ فطری بات ہے کہ وہ مایوس ہو جائیگی۔

معاشرہ کو زیادہ توانا بنانے کے لئے مفکرین کو چاہیئے کہ وہ اسلام کو ایک ایسا نظام فراہم کریں جسمیں بہتر منطق اور قابل قبول مسائل کا حل ہو اور اسی طرح تمام سماجی قوتیں سیاسی عمل میں شامل ہو جائیں۔ یہاں دانشوروں کا سب سے بڑا مشن یہ ہے کہ وہ اصلی اسلام کو سمجھیں وہ اسلام جس کے سایہ میں ہمارے انقلاب نے عظیم الشان کامیابی حاصل کی ہے۔

ہم ایک ایسی دنیا میں رہتے ہیں جو ہمارے اسلامی انقلاب سے سخت

اختلاف کی حامل ہے جبکہ ہم اپنی زندگی کو اسلام کی بنیاد پر ڈھالنا چاہتے ہیں پس یہ معلوم کرنا لازمی ہے کس قسم کا اسلام ہماری زندگیوں کی اساس بنے گا۔ یہاں ہماری مذہبی درسگاہیں اور یونیورسٹیاں اس سوال کا جواب دیں۔ ایسا نہیں کہ اسلام کے سلسلہ میں رائے میں اختلافات نہ ہو۔ گذشتہ صدی میں، اگرچہ اسلامی تاریخ میں نہ ہو، ہمارے سامنے تین اسلام تھے یہ فیصلہ کرنا کہ کونسا اسلام ہم چاہتے ہیں اور ہمیں گروہی اور جماعتی تفرقوں اور جھگڑوں کے سلسلے میں ایک واضح تصور رکھنا چاہئے کیونکہ صحیح اسلام کی بنیاد پر ہی مستقبل کا راستہ طے کرنا ہے۔

روایتی اعتبار سے ہمارے سامنے تین قسم کے اسلام موجود ہیں۔ ایک بازگشت والا، دوسرا ملاوٹ والا اور تیسرا حقیقی اور صحیح اسلام ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان تینوں میں سے کس اسلام پر ہمارے انقلاب کی بنیاد قائم ہے اور کون سا اسلام ہمارے معاشرہ کو بچا سکتا ہے اور عزت اور فخر دے سکتا ہے؟ ہمارا عقیدہ ہے کہ ہمارے انقلاب کی بنیاد صحیح اسلام پر ہے۔ وہ اسلام جسکی جڑیں وحی اور مضبوط وحدانیت پر قائم ہیں۔ ایک وہ اسلام ہے جو انسانوں کے موروثی وقار میں یقین رکھتا ہے اور انسانیت کے لئے خوشی اور مسرت لاتا ہے۔ ایک مسلسل ترقی پذیر اسلام ہے جو نئے ابھرتے ہوئے مسائل کا حل تلاش کرتا ہے۔ پوری تاریخ میں اسلام کی اس تعبیر اور تشریح نے خرابی اور تنزل سے اپنا دفاع تو کیا ہے لیکن اس کو یہ موقع نہیں دیا گیا کہ سماجی سیاسی دائرے میں داخل ہو کر اپنی حیثیت کو منوا سکے۔

یہ فرض کرنا نادانی ہے کہ چونکہ ہمارا انقلاب کامیاب ہو گیا ہے اور ایک اسلامی

جمہوری حکومت قائم ہوگئی ہے پس صحیح اسلام کی کامیابی خود بخود یقینی ہے نہیں، ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ ہم نہایت سنگین اور شدید مشکلات اور خطرات کا مقابلہ کر رہے ہیں لیکن سب سے پہلے اسلام کے ماننے والے اپنے آپ کو عقل، فکر اور پہلے سے زیادہ منطق کے ساتھ آمادہ کریں۔ درحقیقت سیاسی اور فوجی جنگ کے مقابلے میں خیالات کی جنگ کہیں زیادہ نتیجہ خیز اور فیصلہ کن ہوتی ہے۔ سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ ہم نے کون سا اسلام قبول کیا ہے اور کیوں تب ہی ہم کافی اخلاقی اور ذہنی طاقت کے ساتھ اپنے مخالفین کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکیں گے۔ درحقیقت ہمارے انقلاب کے تجربہ نے ہم کو گرانقدر اور ناقابل فراموش سبق سکھائے ہیں۔

امام خمینی نے مرکزی حیثیت حاصل کرنے کے فوراً بعد ہی ظلم، زیادتی، دوسروں پر انحصار، فاسد، ثقافتی زوال اور امریکی سامراجیت کے خلاف اپنی مذہبی اور اسلامی جدوجہد کا آغاز کر دیا تھا۔ تعلیم یافتہ اور اعلی مذہبی طبقہ میں ایسے لوگ تھے جنہوں نے امام کے طریقہ جدوجہد اور اسلام کی تعبیرات کی مخالفت کی۔ ان میں سے کچھ لوگ بادشاہت کے حامی اور ہمدرد تھے اور دوسرے منافع پرست اور خودغرض لوگ تھے۔ ان میں سے زیادہ تر افراد غدار تو نہیں تھے لیکن اسلام کی تعبیر اس انداز سے کرتے تھے کہ جو انقلابی راہ و روش کے مطابق نہیں ہوا کرتی تھی۔ ان میں ایسے لوگ بھی شامل تھے کہ جو شروع میں امام کی حمایت کر رہے تھے لیکن بعد میں جب معاملات کافی سنگین ہوگئے تو انھوں نے اپنی حمایت واپس لے لی۔

امام کے ماننے افراد کی اکثریت تھی ماننے والوں میں ایسے جنھوں نے جیل

اور جلا وطنی کی تکلیفیں اسلیئے برداشت کیں کہ انقلاب کو کامیابی حاصل ہو۔ یقیناً اچھے اور مخلص لوگ تھے اور آج بھی لیکن آخر میں جب وقت آیا کہ انقلاب کو عملی طور پر قائم کیا جائے تو انکی رائے اسلام کے سلسلہ میں امام سے مختلف ہوگئی۔

انقلاب کے بعد بہت ساری صورتوں میں جب سماجی، انصاف کے مسائل اور عدم مساوات سے مقابلہ کی آواز اٹھائی گئی تو کچھ لوگ چلائے کہ اسلام خطرہ میں ہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ وہ لوگ جنہوں نے سماجی انصاف کے نعرے لگائے اور وہ لوگ جو عدم مساوات کے خلاف لڑ رہے تھے وہ سب کے سب صحیح تھے۔ یہاں پر مسئلہ سماجی انصاف کے اصول کا ہے، اور ان لوگوں کا جو سرے سے اس موضوع کو لانا ہی نہیں چاہتے تھے۔ ان لوگوں نے مسائل کو سلجھانے کے سلسلے میں ان تمام عملی اقدامات کا جو ہم اٹھانا چاہتے تھے اسکا مقابلہ کیا۔ ایسے لوگ اس حقیقت کو برداشت نہیں کر سکے کہ امام کا اسلام سماجی انصاف چاہتا تھا اور اسطرح سے انھوں نے اپنی ساری کوششیں اس سمت میں لگا دیں اور ان کو زیروزبر کر دیا۔ امام مجبوریوں ہو گئے کہ اس فکر کا مقابلہ جواں مردی سے کریں اور انھوں نے بیان کیا کہ جس اسلام کو انھوں نے پیش کیا ہے اس کے مطابق سماجی انصاف کا حاصل کرنا انقلاب کے بنیادی مقاصد میں سے ایک ہے۔

ایسے لوگ بھی تھے جو یہ محسوس کرتے تھے کہ عورت کا مقام گھر ہے اور دلیل یہ دیتے تھے کہ کام کی جگہ پر عورتوں کی موجودگی سے خرابی اور اخلاقی زوال ہوتا ہے۔ وہ لوگ عورت کے لئے اعلی تعلیم کے مخالف اور سماجی امور میں عورتوں کی شمولیت کے

خلاف تھے۔ یہ ایک الگ مسئلہ تھا جسکو اسلامی لباس میں شروع کیا گیا۔ انقلاب کے بعد پہلی منتخب مجلس (پارلیمنٹ) کے بہت سے با اثر حلقوں نے یہ کوشش کی کہ اب عورتوں کو مجلس میں بیٹھنے کی اجازت نہیں ملنی چاہیے۔ امام نے اس خیال کی ڈٹ کر مخالفت کی اور انتخابات میں عورتوں کی شمولیت کا دفاع کیا۔ ایسے لوگ بھی تھے جنھوں نے کوشش کی کہ سوائے دینی اور مذہبی لوگوں کے کوئی دوسرا سیاست میں حصہ نہ لے۔ وہ خاص طور سے یونیورسٹی کے طلباء اور پڑھے لکھے طبقہ کے سلسلہ میں مشکوک تھے اور ان پر گمراہ ہونے کا لیبل چسپاں کرتے تھے کیوں کہ ان لوگوں کا ذہنی وزن زیادہ تھا۔ وہ ایک معاشرہ کے بڑے طبقہ کو اپنی سیاسی تقدیر بنانے کے فیصلہ میں روکنا چاہتے تھے اور ان سب کو اسلام کے نام پر حق بجانب ثابت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ امام نے فوری جواب دیا اور ان لوگوں کی رجعت پرستانہ تجاویز کو مطعون کر دیا۔

کچھ نے تمام سماجی اور تہذیبی پروگرام پر اس حد تک تنقید کی کہ امام مجبور ہو گئے انھوں نے تہذیبی سرگرمیوں کے سلسلے میں ایک واضح بیان جاری کیا تا کہ لوگوں کے دماغ سے سب شک و شبہات دور ہو جائیں۔ دوسرے لوگ موسیقی، فلم اور تھیٹر کے مخالفت کر رہے تھے وہ لوگ حرف فنون لطیفہ کی کچھ صورتوں کے مخالف نہ تھے بلکہ وہ دوسرے سے کسی بھی طرح کے ہنر کے مخالف تھے۔ کچھ ٹیلیویژن پر کھیل کے واقعات کے نشر کرنے کے بھی مخالف تھے جو ان کے خیال میں ایک گناہ تھا۔ امام نے ان سب اقدامات کا، جو مذہبی محدودیت اور رجعت پرستی پر مشتمل تھے، ڈٹ کر مقابلہ کیا اور یہ کہا کہ جن چیزوں پر یہ اعتراض کر رہے ہیں وہ معاشرہ کے لئے مفید ہیں اپنی زندگی

کے آخری دنوں میں امام نے مذہبی روایت پرستی کے خلاف بہت ہی عمدہ تبصرہ کیا۔

''ہمیں کوشش کرنی چاہیئے کہ جہالت اور توہمات کی زنجیروں کو توڑ دیں تا کہ ہم حضرت پیغمبر (ص) کے تازہ چشمہ تک پہنچ سکیں، آج اسلام ایک معمہ بن کر رہ گیا گیا ہے اور اس کی حفاظت قربانی چاہتی ہے اور میں دعا کرتا ہوں کہ اس راہ میں پیش کی جانے والی قربانیوں میں خداوند عالم میرا شمار کر لے۔ ۱

وہ لوگ جو انقلاب میں مخلصانہ یقین رکھتے تھے اور اسلام کا وقار چاہتے تھے، انھوں نے یہ پسند کیا کہ امام اس اسلام کو پھیلائیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دوسرے لوگوں کو اپنے حالات ظاہر کرنے کا حق نہیں تھا۔ ہر شخص کو اپنی رائے دینے کا حق ہے لیکن قانون اور تعقل پسندی کی حدود میں۔ بہر صورت ہمیں یہ جاننا چاہیئے کہ ہمارا انقلاب اسلام کی تعبیر پر قائم ہوا ہے؟ کیا وہ گردہ جنکو امام نے بارہا تنبیہ کی ان کو یہ حق نہیں پہنچتا ہے کہ وہ اپنے شدید خیالات کو لوگوں پر تھوپیں اور اپنے مخالفین کو اسلام اور انقلاب کا مخالف بتائیں؟

رجعت پرستی اور مذہبی کٹرپن والے علماء دین جن کو امام نے انقلاب کے لئے بہت بڑا خطرہ بتایا تھا۔ بیکار نہیں بیٹھیں ہیں۔ جو روشن فکر اور سچائی پسند لوگ ہیں انھیں اس خطرہ کو محسوس کرنا چاہیئے اور اس سے بچاؤ کی کوشش کرنی چاہیئے۔

رجعت پرستانہ اسلام کے ساتھ ساتھ ہمارے یہاں ایک کیمپ ایسے لوگوں کا

۱۔ صحیفہ نور جلد ۲۱ ص۔ ۹۱

بھی ہے جنکا عقیدہ ملاوٹی اسلام میں ہے۔ عقیدہ کی ایک مصنوعی غیر معتبر شکل جو صرف پالیزگی پر مبنی ہے بغیر کسی صحیح اسلامی علم کے یا اس کی تعلیمات میں صحیح عقیدہ کے۔ اسلام میں اتنے زیادہ خارجی اور درآمد شدہ عناصر موجود ہیں کہ ان کو سرے سے اسلام کہا ہی نہیں جا سکتا۔ کمزور اسلام کے نمائندے مغربی تہذیب کے طوفون کو سب سے بڑا خطرناک قلعہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ غیر اسلامی یا اسلام مخالف سیاسی لہریں کبھی بھی عوامی مقبولیت نہیں حاصل کر سکیں اور ان کو کبھی بھی اصل خطرہ نہیں سمجھا گیا ہے۔ لیکن وہ ظاہری طور پر معاشرہ میں مغرب سے مستعار خیالات لیکر سرگرم عمل ہیں یا ایسے حضرات جو معاشرہ کے مختلف حصوں میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

اسلام کے سلسلے میں ان رجعت پرستانہ اور ملاوٹی عقائد کی مخالفت کرنے والے ہم سبھی لوگوں کو حقیقی اسلام کی شناخت کر لینی چاہیئے اور اس حقیقی اسلام کی تفہیم و تعمیل کو اپنی بقاو کامیابی کا راز تصور کرنا چاہیئے۔ واضح ہے کہ اسی حقیقی اسلام کے سایہ میں ہم مہلک خطرات سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ جو انقلاب کی صحت اور معاشرہ کے وجود کے لئے خطرناک ہیں۔ یہ وہی صحیح اسلام ہے جسکی امام نے وضاحت کی تھی۔ اور جس کے لئے مطہری[☆۱] جیسے عظیم شخص کو شہید کیا گیا۔ ہمیں امام کے اعلان کے مطابق

....

☆۱۔ آیت اللہ سید مرتضی مطہری (۱۹۷۹۔۱۹۱۹) ایران کے نامور عالم دین تھے۔ شہید مطہری اسلامی انقلاب کی کامیابی میں نمایاں خدمت انجام دی۔ روایتی مدارس اور یونورسٹیوں کے درمیان گہرے تعلّقات کی ایجاد میں نمایاں کردار ادا کیا اسی وجہ سے انقلاب کی کامیابی کے چند ماہ بعد ہی اسلام اور اسلامی انقلاب کے دشمنوں نے انھیں شہید کرڈلا۔ شہید مطہری کی عالمانہ حیثیت کا اندازہ لگانے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ امام خمینی نے ان کی تصانیف کے مطالعہ کی تاکید فرمائی ہے۔ (مترجم)

اسلام کے ان مخالفین کی تلاش کرنی چاہے اور یہ دیکھنا چاہئے کہ امام نے اپنی زندگی کے آخری سال میں جو بیان جاری کیا ہے وہ اسلام مخالف لوگ کہاں ہیں؟ ذراسی توجہ سے معلوم ہو جائیگا کہ امام کی تنقید اور تبصرہ کا نشانہ ان خیالات کی طرف تھا جو اسلام کو ایسا پیش کرتے ہیں جیسے وہ کسی بھی طرح کی ترقی کا مخالف ہے اور ہمارے معاشرہ کو جو مشکلات درپیش ہیں، ان کے حل کی تلاش میں ناکام رہا ہے۔

اگر ضعیف اسلام نے مطہری کو شہید کر دیا تو رجعت پرستانہ اسلام نے یہ کوشش کی کہ ان کے اعلی افکار کا انکار کیا جائے۔

وہ مقابلہ آرائی جو مطہری اور بہشتی ۱☆ کے سلسلے میں کی گئی، یہ ہمارے معاشرہ کے لئے سنگین خطرہ ہے۔ اور ہم نے اس لہر کا مشاہدہ اس وقت کیا جب ہاشمی رفسنجانی ۲☆ نے سماجی انصاف کے مسئلہ کو پیش کیا۔

☆۱۔شہید بہشتی انقلاب اسلامی ایران کی عظیم اور نمایاں شخصیتوں میں سے ایک تھے۔امام خمینی کی جلاوطنی کے زمانہ میں اسلامی انقلاب کو کامیاب بنانے میں انھوں نے کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ اسلام اور اسلامی انقلاب کے دشمنوں نے ایک زوردار بم دھماکے کے دوران انھیں ۷۲ دیگر خدمتگزاران انقلاب کے ہمراہ شہادت سے ہم آغوش کر دیا۔محمد حسین بہشتی (۱۹۸۰۔۱۹۲۱)

☆۲۔علی اکبر ہاشمی رفسنجانی (پ ۱۹۳۳) ایک دینی اور سیاسی رہنما جنھوں نے اسلامی جمہوریہ ایران کے اہم مقامات پر خدمات انجام دیں۔ اور بعد میں بحیثیت صدر جمہوریہ ایران کی خدمت انجام دی۔(۱۹۸۹تا ۱۹۹۷) سر دست وہ تشخیص مصلحت نظام نامی تنظیم کے سربراہ ہیں۔

حقیقی اسلام کی مکمل شناخت اور معاشرہ کو اسی پر قائم کرنے کے لئے ہماری حوصلہ افزائی کا سب سے بڑا وسیلہ درحقیقت یونورسٹیوں اور دینی درسگاہوں سے وابستہ مذہبی اور مخلص نوجوان ہیں۔ علم و دانش کی حمایت اور صاحب شہرت علما دین کی سرپرستی کے سایہ میں ہم لوگوں کو مذہبی دانشوروں کی ایک نئ جماعت تیار کرنی چاہئے جو جدید ترین اطلاعات کے حامل اور روشن خیال ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ہم لوگوں کو اسلام کے حقیقی نظریات کو سمجھنے کے لئے مسلسل کوشش کرنی چاہئے کیونکہ اسلام ہی ہمارے انقلاب کی اساس ہے۔ اگر ہم حقیقی اسلام کی شناخت اور اس کی وضاحت میں کامیاب ہو گئے تو پھر ہم دیگر مکاتب فکر سے پوری طرح محفوظ ہو جائیں گے۔

آٹھواں باب

اطلاعات کی دنیا کے بارے میں مشاہدات

کیونکہ ہمارے قابل ذکر موجودہ اختلافات ان مذہبی علم اصول ثقافت اور الفاظ کے معنی ومفہوم سے تعلق رکھتے ہیں جن کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ دوسری مشکلات اور دقتیں ان لوگوں کی پیدا کی ہوئی ہیں جو دنیائے اسلام کو متحد نہیں دیکھنا چاہتے اور اگر انہوں نے ان مصیبتوں کو پیدا نہیں کیا تو کم ازکم موجودہ اختلافات کو ہوا دینے میں وہ بنیادی کردار ادا کر رہیں ہیں۔ پس اختلافات کو ختم کیا جا سکتا ہے لیکن بعض اختلافات استثنائی اور فطری نوعیت کے حامل ہیں کیونکہ لوگ اپنی فطرت کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ ہم سب ایک طرح نہیں سوچتے ہیں اور ہماری تعبیرات اور تشریحات میں بھی اختلاف موجود ہے، لہذا متعدد وگوناگوں مشترکات کی روشنی میں ہم اپنے اختلافات کو کم کرکے اپنی ترقی اور کمال کی طرف بڑھ سکتے ہیں۔ افکار میں یکسانیت ٹکراؤ پیدا نہیں کرتی ہے۔ دوطرح سے سوچنا نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے سے ٹکراؤ یا کسی مسئلہ کی ایجاد نہیں ہے فکروں اور خیالوں کے درمیان اختلاف وٹکراؤ فکری ارتقاء وکمال کا باعث ہوا کرتا ہے۔ واضح رہے کہ فکر اور سوچ کی دو حصوں میں تقسیم اختلاف وعداوت اور جارحیت وجنگ کو جنم نہیں دیتی بلکہ منزل کمال تک رسائی حاصل کرنے کا وسیلہ ہوتی ہے اور اس منزل کمال کو حاصل کرنے کے لئے سب سے پہلے ہمیں اتحاد کی بنیاد کی طرف پلٹنا چاہیئے اور یہ بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ "گفتگو"، عقلی معیار ودلائل اور تعقل پسندی کی بنیاد پر ہی ہوگی۔

۶۔ مذہبی معاشروں کی ایک بڑی بیماری اور بدقسمتی، جس میں دنیائے اسلام متعدد مرتبہ مبتلا ہو چکی ہے، یہ رہی ہے کہ مذہب کے ساتھ تعقل پسندی ممکن نہیں لیکن

اطلاعات کی دنیا کے بارے میں مشاہدات

ہمارے عہد میں انسان کی تقدیر کو بنانے اور سنوارنے میں اطلاعات کے کردار کو مرکزی حیثیت حاصل ہے یہاں تک کہ اطلاعات نے، جو موجودہ دنیا میں طاقت کا عظیم و خصوصی اور اہم ذریعہ ہے، دنیا کی فوجی اور سیاسی طاقت کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ وہ لوگ جو افتخار، طاقت اور ترقی چاہتے ہیں ان کو اس اہم ذریعہ کا نظم و انتظام سیکھ لینا چاہیئے اور مسلسل ترقی کرتی ہوئی اطلاعات کی ٹیکنولوجی سے ہم آہنگ رہنا چاہیئے۔

ہر ملک میں بروقت اطلاعات اور موثر ذرائع اطلاعات کو ترقی کے مراحل میں ایک مرکزی نقطہ کی حیثیت حاصل ہے۔ ہم مسلسل بڑھتی ہوئی ترقی کے اس میدان میں پیچھے نہیں رہ سکتے پس ہمیں ترقی کی نت نئی منزلیں طے کرنے والے میدان میں بھرپور تعاون و مدد ہمیں کرنی چاہیئے۔ اطلاعات کو مؤثر انداز میں محفوظ رکھنے اور

پھیلانے میں ہمارا عملی تعاون لازمی ہے جو کوئی آسان کام نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں زیادہ تر معلومات اور تحقیقات دنیائے اطلاعات کی اور اس کی تکنیکی حدود کی طرف مرکوز ہو جاتی ہیں اور انسان کی کوشش اور اسکا سیاسی پہلو دب کر رہ جاتا ہے۔ ہماری تقریر کے لئے یہ کام بہت اہم ہے۔

موجودہ پیچیدہ شکل میں اطلاعات کی ٹیکنولوجی جدید تہذیب کی بہت بڑی کامیابی کو نمایاں کرتی ہے۔ جو اطلاعات کو کنٹرول کرنے کے لئے استعمال کرتا ہے وہ تمام دنیا میں غلبہ پالیتا ہے۔ پس اطلاعات کی دنیا کی تحقیقات اصل میں جدید تمدن کو کشف کرنے کے مترادف ہے۔ جب تک ہم اس اہم سوال کو نہیں تلاش کرتے ہیں اس وقت تک ہم میں وہ اعتماد اور عقل نہیں پیدا ہوگی جس سے ہم جدید تمدن سے تعلق کو سمجھ سکیں۔ ورنہ ہم ایک ایسی دنیا میں رہینگے جس کے قانون وقاعدے دوسروں نے بنائے ہیں۔ حالات کے رحم وکرم پر ہی زندگی بسر کرنی ہوگی اور ہم اپنی قسمت کے مالک نہیں ہونگے۔

ہم اطلاعات کی دنیا مغرب کے ہر غلبہ کا مقابلہ دو محاذوں پر کر سکتے ہیں ایک تو سائنسی اطلاعات کا دائرہ اور دوسرا وہ دائرہ جس میں اطلاعات کی سیاسی سماجی اور ثقافتی اہمیت ہے۔ پہلے معاملہ میں سائنسی طریقہ کو باتفاق تسلیم کیا جاتا ہے کہ یہ بہت ہی مئوثر طریقہ ہے دنیا کو سمجھنے کا۔

سائنس نے انسانی زندگی کو بالکل بدل دیا ہے اور کوئی قوم اور لوگ بغیر اسکی برکتوں کے زندہ نہیں رہ سکتے ہیں۔ سائنسی میدان میں پیچھے رہ جانا اور کسی کم ترقی اور

ٹیکنولوجی کی کامیابیوں کو حاصل نہ کرنے کا ایک بہت ہی قابل رحم نتیجہ نکلتا ہے۔ پھر بھی تمام دنیا کی سائنسی اہمیت اور ترقی ہمیں باز نہیں رکھ سکتی یہ بنیادی سوال پوچھنے سے کہ اس سائنسی اور ٹیکنولوجیکل معاملہ میں انسان کی کیا حیثیت ہے۔ ہم کوئی سائنس کا بت بنا کر اس کو پوجتے نہیں اگر چہ وہ انسانی عقل سے بہت زیادہ دور ہے۔

ہم مسلمانوں کے لئے جدید سائنس کے مزاج کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ ایک زمانہ میں اعلیٰ درجہ کے بین الاقوامی حیثیت کے سائنس داں ہمارے درمیان موجود تھے۔ لیکن اب ہم اس میدان میں مغرب سے بہت پیچھے رہ گئے۔ ہم کو اس میدان سے نکال دیا گیا ہے اور اب ہم مغرب کے جدید تمدن سے صرف ایک معمولی استعمال کنندہ بن گئے ہیں لیکن اگر ہم اپنی عقل اور تعقل پسندی کا استعمال کریں تو ہمیں جلد ہی موقع مل سکتا ہے کہ ہم دوسرے درجہ کی حالت سے باہر آ جائیں اور انسانی تقدیر کے راستہ کو جلد ہی متعین کرنے میں موثر کردار ادا کریں۔

اٹھارویں صدی میں اہل مغرب نے سائنس اور ٹیکنولوجی کے جادو کو اپنا لیا۔ کانٹ جیسے عظیم مفکر نے اپنے روحانی نظام کو طبعی سائنسوں کے اصولوں سے میل کھانے والا بنا دیا۔ باوجود اس اٹھارویں صدی کے یورپ کے اس رجائیت کے لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ سائنس بہت سارے ایسے مسائل کو جو اس کے دائرہ میں نہیں آتے۔ حل نہیں کر سکتا۔

آج جدید تہذیب کے وفادار وکیل بھی، اور سماجی، اقتصادی اور سیاسی سسٹم جو اس نے پیدا کیا ہے۔ ایسا سوچتے ہیں کہ سائنس جو عارضی حل تلاش کئے ہیں وہ زیادہ

مکمل اور نئے نظریہ سے ہمیشہ جھوٹے ثابت ہو جاتے ہیں۔ سائنس کے میدان میں کوئی بھی حرف آخر نہیں کہہ سکتا کیونکہ سائنس اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے کہ جو سائنسدان تصور کرتے ہیں اور عمل میں لاتے ہیں کوئی اور دوسرا راستہ اسکو سمجھنے کا نہیں ہے کہ سائنس دانوں کے معروضی فیصلے صحیح حقیقت کا اظہار کرتے ہیں۔ آج کے زمانے میں سائنس کی مصروفیت پر ہی سب سے زیادہ سوال کیئے جا رہے ہیں۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ سائنس نے عملی پیچیدگیوں کو حل کرنے میں غیر معمولی اثر ڈالا ہے اور ہمارے لئے اور کوئی دوسری راہ نہیں ہے کہ ہم تجربہ اور غلطیوں کی ٹیکنیک کو ہی استعمال کریں، باوجود اسکے کہ اٹھارویں صدی کے اہل یورپ کے رجائیت پسندانہ رویہ پر ہم اپنا پورا اسماجی نظام جدید سائنس کے اصولوں پر نہیں رکھ سکتے کیونکہ یہ روحانی فلسفیانہ اور عرفانی ضرورتوں کو جو انسان کی ہیں حل کرنے میں ناکارہ ثابت ہوا ہے۔

یقیناً ہمارے خدشہ اور سائنس کی محدودیت کا نتیجہ یہ نہیں ہے کہ ہم قرون وسطیٰ کی طرف لوٹ چلیں اور نہ ہی ہم مذہب اور روحانیت ان کے محدود اور پسماندہ نظریات کو جلاوطن کر سکتے ہیں جو ہمارے زمانہ میں موجود ہیں۔ جدید انسان کو اپنی زندگی کو بامعنی بنانے کے لئے روحانیت اور مافوق الفطرت اشیاء کی تعبیر کی ضرورت ہے مغربی تمدن میں سائنس اور ٹیکنولوجی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے لیکن ان کے معنی کے سلسلہ میں بے یقینی نے مغرب میں عمومی مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔

یہ مسئلہ انسانی علوم میں بمقابلہ طبعی یا فطری علوم کے زیادہ شدت سے محسوس کیا

جاتا ہے۔ جدید تمدن کا زیادہ گہرا تعلق سیاسی، سماجی اور اقتصادی نظریات سے ہے نہ
کہ فطری سائنسوں سے۔ انسانی علوم میں مطالعہ کا موضوع اور مقصد ایک ہے کیونکہ
جب انسان خود مطالعہ کرتے ہیں تو وہ ان کے معاشرہ اور سیاسی نظام کا مطالعہ ہوتا
ہے۔ تلاش و تحقیق کا انحصار ان مقاصد اور مفروضات پر ہوتا ہے جو عامل ہیں یا سائنس
دانوں کے نہ کہ فی الحقیقت اغراض و مقاصد۔ سائنس دانوں کے گروہ کی شناخت کے
معاملہ کا اثر سائنسی اور تہذیبی دائروں پر پڑنا فطری ہے۔

اطلاعات کے طوفان نے ہمارے عہد میں تمام انسانیت کے حصوں کو اس حد
تک پار کرلیا ہے کہ اہل یورپ بھی سمجھنے اور انتخاب کرنے کی صلاحیت میں پیچھے رہ گئے
ہیں جبکہ اطلاعات کو پیدا کرنے والے وہی ہیں اور ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کا
کردار ثانوی ہے۔ برقی اطلاعات کا نظام جدید تمدن کی پیداوار ہے اس وجہ سے آج
کی اطلاعاتی بنیاد پر قائم عمومی تہذیب مغربی تمدن کی اقدار سے بندھی ہوئی ہے۔
مغربی تہذیب کے متوالے اطلاعات کی دنیا میں رونما ہونے والے انقلاب کو ایک
بہت ہی نمایاں کامیابی سمجھتے ہیں۔

ہم میں سے وہ لوگ جو مغرب کے باہر رہتے ہیں اطلاعات کی دنیا ان کے
لئے پہلودار چیلنج ہے۔ آج اطلاعات کو ترقی یافتہ صنعتی ممالک اپنے اقتصادی اور سیاسی
مفاد کی حفاظت کے وسیلہ کی حیثیت سے استعمال کر رہے ہیں۔ چاہے ان کے یہ مفاد
دنیا کے عوام کی اکثریت کے مفاد مصالح سے میل نہ کھاتے ہوں اور وہ لوگ جدید
تمدن کے دائرہ سے باہر ڈال دیئے گئے ہوں۔

پس اطلاعات کے انقلاب کے مفاد کو انسانیت کے لئے کچھ لوگ کتنی بھی خوش بنی کا اظہار کریں لیکن اسمیں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ سیاسی اور تہذیبی موضوعات پر مشتمل اطلاعات گڑھی جاتی ہیں تا کہ صنعتی طاقتوں کے مفادات کی حفاظت کی جائے جو محروم و پسماندہ اور مظلوم لوگوں کے حقوق میں خیانت ہے۔

ہم اس طرح کی اطلاعات کا استعمال کرنیوالے لوگ اس بات کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ اسطرح کی اطلاعات کو وجود میں لانے اور پھیلانے میں مغرب کی برتری کو قائم رکھنے کی سیاسی خواہش ہے۔ غیر مغربی لوگوں کو اس بات کی تعلیم دی جاتی ہے کہ مغرب کی برتری کو قانونی اعتبار سے جائز تسلیم کیا جائے۔ مغربی تمدن نے ہمیشہ جملہ اطلاعات اور وسائل ابلاغ پر قبضہ کر کے اس کو لوگوں کے ذہن اور ان کی زندگی پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ آج بھی اسی کام میں سرگرم ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم اپنے آپ کو اطلاعات کی دنیا سے جس پر مغرب چھایا ہوا ہے، الگ تھلگ کر لیں۔ درحقیقت یہ بات نامناسب بھی ہے اور ناقابل عمل بھی کیونکہ اطلاعات کا دائرہ دنیا میں ہمیشہ وسیع سے وسیع تر ہو رہا ہے۔ آج کی دنیا کے واقعات کے بارے میں باخبر ہونا لازمی ہے تا کہ دنیا میں ہم اپنے مقام کو سمجھ سکیں اور اپنے مستقبل کے لئے منصوبہ بندی کر سکیں۔ اگر ہم دنیا کی اطلاعات کے سلسلہ میں الگ تھلگ ہو جاتے ہیں تو ہم دوسروں کے مہرے اور غلام بن جائینگے۔ کیونکہ وہی لوگ ان اہم اور حساس منابع پر کنٹرول رکھتے ہیں۔

ہمیں اپنی تاریخی ارتقاء اور سماجی بلوغیت کی اس سطح پر پہونچا دینا چاہئیے کہ

جہاں سے ہم دوسروں کے افکار اور ان کی کوششوں کے بارے میں صحیح فیصلہ کرسکیں اور اس طرح سے ہم دنیا میں اپنے مقام اور مرتبہ کو پہچان لیں اور اپنے گھر کو ٹھیک کرلیں۔ اسطرح ہم یہ انتخاب کرسکتے ہیں کہ نئی دنیا میں ہمارے لئے کیا چیز مفید ہے اور کیا چیز مفید نہیں ہے۔ جو چیز غیر مفید کو رد کرسکتے ہیں۔ ہم تین محاذوں پر متحرک ہوجائیں۔

سب سے پہلے ہمیں اپنے عہد کی خصوصیات اور مغربی تمدن کی اپنے عہد کا سب سے بڑی علامت سمجھنا چاہیئے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مغربی تمدن کی اقدار اور اسکے اصولوں کو سمجھنا دونوں ضرررساں انتہاؤں سے یعنی اس سے نفرت اور یا پورے طور پر اس کے ساتھ بہہ جانے سے خود کو آزاد کرنا۔ دوسرے محاذ پر ہم لوگوں کو اپنی تاریخی شناخت کو جو گوناگوں مصائب کا سامنا کرنے کے بعد بھی انسان دنیا کے لئے گرانقدر تحفے کی حامل رہی ہے، مضبوطی سے پکڑے رہنا چاہیئے۔

اور تیسرے محاذ پو ہم لوگوں کو ان مسائل کی طرف توجہ کرنی چاہیئے جو ہمارے معاشرہ کو باہر سے دھمکیاں دے رہے ہیں۔ وسعت پسندانہ مغربی سیاست، اقتصاد اور ثقافت پر غلبہ پانے والا مزاج۔ اور ہمیں ساتھ ہی ساتھ اپنے اندرونی مسائل اور جھگڑوں کی طرف بھی توجہ دینی چاہیئے۔

ہماری زیادہ تر روائتیں انسانوں کی بنائی ہوئی ہیں وہ اپنے عہد میں چاہے کتنی بھی عظیم رہی ہوں وہ ایک مختلف تاریخی زمان و مکان سے متعلق ہیں اور بہرحال ہمارے لئے قابل احترام اور مقدس ہیں۔ آج خیالات میں کٹرپن کی وجہ سے ہمارے معاشرہ میں بہت سی رکاوٹیں پیدا ہوگئیں ہیں جو انسانی افکار اور کامیابیوں کو

استعمال کرنے سے روک رہی ہیں۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ صرف فطری دنیا ہی نہیں بلکہ مذہب کے سلسلہ میں بھی تشویش اور تحقیق جاری رکھنی چاہیئے کیونکہ مذہب کے سلسلہ میں ہماری تعبیرات ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں۔

ماضی سے ہمارا تعلق ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم مغربی تمدن کی جو جدید کامیابیاں ہیں، انکا انکار کردیں ہم اپنے ماضی کی طرف وہاں رہنے کے لئے نہیں لوٹ سکتے بلکہ اپنی شناخت کو سمجھنے کے لئے جو مغربی تمدن وثقافت کے حملہ کیوجہ سے سمٹ کر رہ گئی ہے۔ علم اور عزم سے ہم اپنا مستقبل بنا سکتے ہیں لیکن اس کام کیلئے تمام مسلم دنیا کے مفکرین اور ماننے والوں کی مدد اور تعاون لازمی ہے۔ ہم مسلمانوں کی ایک عظیم تاریخی میراث ہے جسے ہمیں آج کی دنیا میں زندہ رکھنا چاہیئے۔

مسلم دنیا کے فرقوں کے درمیان موجود اختلافات کے باوجود اسلامی فکر میں اتحاد اور تعاون پوری اسلامی دنیا پر محیط و نمایاں ہے۔ اسلامی تاریخ کی بہت سی صدیوں پہلے اندلسی فقیہوں نے دمشق اور بغداد میں اس بات کی تلقین کی تھی جس بات کو فارسی فلسفیوں اور ریاضی دانوں نے افریقہ اور میسو پوٹا میا میں رہ کر اپنے گھر میں محسوس کیا تھا۔ ہم مسلمانوں کے پاس ایک مضبوط اتحاد کی بنیاد موجود ہے جو مستقبل میں بہت مضبوط تہذیبی تحریک کو جنم دے سکتی ہے۔

سب سے پہلے یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ ہم مشترکہ تاریخی تعلقات اور نظام اقتدار کے حامل ہیں جو ہمیں ایک عظیم تمدن کی حیثیت سے اسلام نے عطا کیا ہے ایک بہت بڑے تمدن کا منبع ہے۔ اور یہ چیز ہمیں اس سے حاصل ہوتی ہے اگرچہ یہ

دور ماضی کی طرح یہ تمدن اب دنیا میں چھایا ہوا نہیں ہے لیکن آج بھی یہ ایک مشترک تجربہ کے عظیم منبع کی، جو سب مسلمانوں کا ہے، نمائندگی کرتا ہے۔ ہمارا تعلق اسلام کی خدا پرستی پر مبنی ہے جو کہ خدا کی وحدانیت اور مسلمانوں کو آپس میں ایک دھرے کی کیل کی طرح ایک دوسرے سے باندھتا ہے۔

دوسرے یہ کہ اس صدی میں لوگوں کے درمیان روز افزوں بیداری نے تمام مسلمانوں میں بڑھتی ایک مقصد کے لئے اتحاد کا ایک غیر معمولی احساس پیدا کردیا ہے کیونکہ ہم سب یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم مختلف شکلوں میں نوآبادیاتی نظام کا شکار رہے ہیں۔ ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس نے نوآبادیاتی طاقتوں کی وجہ سے اپنے وقار اور اپنی آزادی کو تباہ و برباد ہوتے ہوئے نہ دیکھا ہو۔ ہم سب اپنی آزادی اور حریت کو اس غلبہ سے بچانا چاہتے ہیں اگر ہم اپنے مشترکہ درد اور مصیبتوں کو ملادیں اور اپنے نظریات اور عقائد میں اتحاد پیدا کرلیں تو پھر ہم اپنے معاشروں کی بہتری اور خوشحالی کے لئے بیج بودیں گے۔ اطلاعاتی منابع میں شرکت اور تعاون اس اتحاد اور اتفاق کو اور زیادہ واضح کرتا ہے۔

اسلامی جمہوریہ ایران نے دنیا پر غالب و حاکم سیاسی نظام سے اپنے اختلافات کے باوجود ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ جملہ مسلم ممالک کے درمیان بہت گہرے تہذیبی اور سائنسی تعلقات ہونے چاہئیں اور آج بھی ہمارا عقیدہ ہے کہ سیاسی اختلاف کے باوجود ایسے حالات پیدا کئے جائیں کہ پوری مسلم دنیا کے سائنس دان اور مفکرین مل کر کام کریں سب مسلمان اتحاد پیدا کریں اور معاشرہ کی ترقی کے لئے باہم مل کر کوشش کریں۔

نواں باب

روایت، جدیدیت اور ارتقاء

اس حقیقت کو فراموش کر دیا جاتا ہے کہ مذہب کو تعقل پسندی کے ذریعہ ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ سوائے تعقل پسندی کے انسان کے پاس کوئی دوسرا ذہنی آلہ موجود ہی نہیں ہے۔ عقیدہ ہونا اور عقیدہ کے نہ ہونے کا اختلاف صرف یہ نہیں ہے کہ ایک غیر مذہبی عقل کا استعمال کرتا ہے اور اہل مذہب کو اس تعقل پسندی کی ضرورت نہیں ہے۔ ان دونوں کو عقل کی طاقت کی ضرورت ہے اور اس کا استعمال کرنا چاہیئے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ صاحب عقیدہ کے پاس دو کتابیں ہیں جبکہ بے عقیدہ شخص صرف ایک کتاب کا حامل ہوتا ہے۔ ایک مذہبی آدمی کے علم کا منبع بڑا ہے چنانچہ اسی اعتبار سے اس کی کامیابیاں بھی زیادہ ہیں۔ ایک شخص جو منکر خدا ہے وہ صرف فطرت کی کتاب سے ہی الہام حاصل کرتا ہے اور وہ اس سے اپنی عقل کی مدد سے نتائج حاصل کرتا ہے۔ ایک مذہبی شخص کے پاس یہ کتاب بھی ہے اور ایک انسان ہونے کی وجہ سے اپنی عقل کو کام میں لاتے ہوئے وہ فطرت کا مطالعہ کرتا ہے۔ وہ علم حاصل کرتا ہے، سائنس اور فسلفہ کا ادراک کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک دوسری کتاب سے استفادہ کرتا ہے۔ وہ کتاب جو آسمانی قانون اور فیوض و الہام بخش ہے۔ وہ اشخاص جو مذہب کو معقولیت و تعقل پسندی کے مدمقابل رکھتے ہیں وہ اپنی کمزور تعبیر کو 'مذہب' خیال کرتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ الہام زمان و مکان سے ماوراء ہے جبکہ ہمارا وجود زمان و مکان کا پابند ہے۔ ہماری فہم زبان و مکان کی حدود سے آزاد نہیں ہے۔ پس ہماری فہم و ادراک زمان و مکان کی محدودیت کے ساتھ کتاب تخلیق اور آسمانی قانون کو نہیں پا سکتی ہے۔ اس طرح علم بھی ارتقاء کی منازل طے کرتا ہے۔

روایت، جدیدیت اور ارتقاء

روایت، جدیدیت اور ارتقاء ان تینوں کا مفہوم سمجھنا اور ان کے مابین تعلقات دریافت کرنا ہمارے عہد کے دانشوروں خاص طور پر مغربی ممالک کے باہر رہنے والوں کے لئے نہایت ہی غور و فکر کا کام ہے۔ ان تینوں اصطلاحوں پر اگر ہم سطحی اور سرسری نظر ڈالیں تو اس نتیجہ پر پہونچیں گے کہ جدیدیت ایک مغربی تصور ہے جس کا مطلب روایت سے بغاوت ہے اور ارتقاء جدیدیت کا ماحصل ہے۔ یہ ان لوگوں کے لئے بہت ہی اہم منصوبہ بند مقصد ہے جو مغربی اقدار اور افکار کے دائرے سے باہر ہیں۔ ان مفروضات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ارتقاء کی منزل تک پہونچنے کے لئے جدیدیت کا آغاز ضروری ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب روایت سے بغاوت ہو۔

لیکن مذکورہ مفروضات سے صرف وہی لوگ مطمئن ہو سکتے ہیں جو ذہنی پستی کے شکار ہیں یا وہ لوگ جو انسانی اقدار کے تئیں کوئی ذمہ داری محسوس نہیں کرتے ہیں۔ یہ مسئلہ اتنا پیچیدہ ہے کہ اس کا حل آسان نہیں ہے۔ روایت محض ہدایات اور نسخوں سے تبدیل نہیں ہو سکتی، نہ ہی جدیدیت کا وقوع آسان ہوتا ہے۔ چونکہ جب

تک لوگ اپنے اندر تبدیلی نہیں لائیں گے اس وقت تک ان کی زندگی میں فیصلہ کن بدلاؤ نہیں آسکتا ہے اور عوامی زندگی میں تبدیلی کا مسئلہ بہت ہی پیچیدہ ہوتا ہے جس کے حل کے لئے لوگوں میں اکثر وسائل کی کمی ہوتی ہے۔

روایت ، جدیدیت اور ارتقاء جیسی اصطلاحات ابہام سے بھری ہوئی ہیں۔ اس لئے ان کی تعریف پر لوگ متفق نہیں ہیں اور سچ پچ کبھی اتفاق ہو بھی نہیں سکتا ہے۔ جو لوگ اس بحث میں مشغول ہیں انھیں چاہیئے کہ غلط فہمیوں کو کم سے کم کرنے کے لئے پہلے وہ ان اصطلاحات کو واضح کریں پھر کوئی تھیوری یا نسخہ پیش کریں۔

مَیں جدیدیت اور روایت سے کیا سمجھتا ہوں ؟ جب ہم جدیدیت کی بات کرتے ہیں تو یقینی طور پر ہم نئے اور ترقی پذیر تصورات اور اداروں کی بات کرتے ہیں ۔لیکن کیا سارے نئے تصورات جدیدیت میں شامل ہیں ؟ یا جدیدیت کا تعلق تاریخ کے ایک خاص دور سے ہے ؟ انسانی معاشرہ میں ہمیشہ یہاں تک کہ ابتدائی دور میں بھی مسلسل تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ عہد جدید اور عہد قدیم کے مابین بنیادی فرق عہد قدیم کی کم رفتار و ساکن فطرت بنام سرگرم و متحرک عہد جدید ہونے میں نہیں ہے بلکہ عہد قدیم میں تبدیلی کی رفتار دھیمی تھی اور عہد جدید میں تیز ہے۔ فی الحال تہذیب اور ثقافت کے مابین تعلق کے بارے میں پیچیدہ بحث سے قطع نظر مناسب یہ ہے کہ بحث کا آغاز یوں کریں کہ ہر ثقافت ایک خاص تہذیب سے ہم آہنگ ہے اور اس میں اس تہذیب کے مطابق تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ گذشتہ تہذیب سے بغاوت کرنے اور پرانی تہذیب کے مساوی تمدن سے فرار کے نتیجے میں ہی جدید تہذیب کا ظہور ہوا

ہے۔ پھر جدید تہذیب ایک ایسے تمدن کے سایہ میں پروان چڑھی جو اس کے لئے
موزوں اور اس کی ضروریات کے مطابق تھی۔

تعریف کے مطابق روایت کا تعلق ماضی سے ہے لیکن ہم تمام پرانی چیزوں کو
روایت سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ ہم خدائی یا فطری روایات کی بات کرتے ہیں جو غیر
متحرک اور دائمی ہوتی ہیں۔ انسانی وجود اور زندگی پر حکومت کرنے والے قوانین
خدائی یا فطری روایات وابستہ ہوا کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ان قوانین کی دریافت میں
انسانوں سے غلطیاں سرزد ہو جائیں اور بعد میں انھیں ان غلطیوں کا احساس ہو لیکن جو
تبدیلیاں رونما ہوئیں ہیں وہ قوانین کی سمجھ ہے نہ کہ قوانین بذاتِ خود۔ ہم تبدیلی کے
اصول اور دنیا کی روح میں عدم استحکام کو تسلیم کر سکتے ہیں ٹھیک اسی طرح جس طرح
صدر الموت ''الھین'' (بڑے بڑے مسلم فلسفیوں کے درمیان) متحرک روح میں
یقین رکھتے ہیں یا عین مارکسیوں کی طرح جن کے نزدیک دنیا اندرونی تضادات سے
مجبور ہے اور بالآخر یہ دنیا تبدیلی کی ایک دائمی حالت کی نذر ہو جاتی ہے۔ اس طرح
تغیر کا اصول ہر چیز کے لیے مستقل ہوتا ہے۔

میرے نزدیک روایت ایک انسانی مسئلہ ہے جو لوگوں کے ذہنی اور جذباتی
میلانات کا جزو ہوتا ہے؛ بہ الفاظ دیگر روایت لوگوں کے ایسے کارناموں، عقیدوں اور
نظریوں پر مشتمل ہوتی ہے جس کا انسان عادی ہو جاتا ہے اور جو گذشتہ اعمال کی بنیاد پر
معاشرہ میں رائج ہوتی ہیں۔

اس تعریف کے مطابق روایت کلچر کے مماثل ہے اور دوسری بہت سی صورتوں

میں روایت بذاتِ خود کلچر کی ایک علامت ہے لیکن ہم سبھی کلچر کو روایت نہیں کہہ سکتے ہیں۔ چونکہ روایت معاشرہ کا موجودہ کلچر ہوتی ہے جو کبھی ایک موافق تہذیب پر اثر انداز ہو چکی ہوتی ہے۔ لیکن اب جبکہ پرانی تہذیب فرسودہ ہو چکی ہے مساوی کلچر کی صورت برقرار ہے اور تہذیب کا تحفظ حاصل ہے۔ میری مراد ترقی یافتہ اور پیچیدہ تہذیب سے نہیں ہے بلکہ ایک خاص معیار زندگی سے ہے۔ اس لئے انسان کے پاس اس کے ابتدائی دور میں بھی ایک تہذیب تھی۔ سچ مچ جب تک انسانی معاشرہ قائم رہے گا اس وقت تک تہذیب باقی رہے گی۔

بنیادی تہذیب کے فرسودہ ہونے کے باوجود دورِ حاضر میں ماضی کا وجود ممکن ہے چونکہ کلچر کا انسانی زندگی سے گہرا تعلق ہے اور ہو سکتا ہے کہ یہ تعلق تہذیب سے بھی زیادہ گہرا ہو۔ صدیوں تک بہت سے کلچر تہذیب سے زیادہ مدت تک برقرار رہے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر اگر تہذیب بدل گئی ہے تو آج کی زندگی میں روایت گذشتہ کلچر کا عکس ہے۔

جب ایک نئی تہذیب وجود میں آتی ہے اور کلچر اس کے لئے برمحل ہوتا ہے تو وہ لوگ جو گذشتہ کلچر کے نام ونشان کے اردگرد گھومتے رہتے ہیں۔ انھیں ایک نئی تہذیب کے مدمقابل ہوتے ہوئے ایک طرح کے تضاد کا احساس ہوتا ہے۔ ایک طرف زندگی کی حقیقتوں کو جدید تہذیب متاثر کرتی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ جو تضاد ہے وہ یہ ہے کہ جدید تہذیب ابھی بھی اپنی جگہ پر ہے۔ لوگ اور قومیں ہماری طرح اس تضاد سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ ہمارے معاشرے کی زیادہ تر غیر یقینیاں جو مغرب

سے بہت ہی مختلف ہیں اس تضاد کے ساتھ منسوب ہیں۔ اور جب تک یہ بنیادی طور پر حل نہیں ہوجاتے اس وقت تک بحران پیدا ہوتا رہے گا۔

مغربی معاشرہ جو جدید تہذیب قبول کررہی ہے وہ روایت سے بغاوت کا نتیجہ ہے۔ جدید تہذیب کی شروعات کو اس نقطہ نگاہ سے دیکھا جانا چاہیے کہ جب کیتھولک چرچ کے اقدار وافکار اور سرمایہ داری کی سماجی واقتصادی روایات پر سوالیہ نشان لگائے گئے اور پھر انھیں مسترد کردیا گیا۔ اس چیلنج میں فاتح جدید تہذیب اور اس اخلاقی نظام کے لیڈر تھے۔ اس نظام کی اساسیات کو یورپ سے امریکہ برآمد کیا گیا اور پھر ان دونوں مقام سے دنیا کے دوسرے حصوں میں لے جایا گیا۔ وہاں یہ اساسیات غالب ہوگئیں یہاں تک ہمارے ملک میں بھی اثر انداز ہونے لگیں۔

تاہم ہمارا گذشتہ کلچر ہم میں موجزن ہے؛ یہ کلچر مغربی کلچر سے بہت ہی مختلف اور ناموافق ہے۔ بہ الفاظ دیگر ہماری روایت دوسری تہذیب کے لیے زیادہ موزوں اور مناسب ہے۔ وہ تہذیب مردہ ہوچکی ہے اور موجودہ تہذیب کی سرحدیں وسیع ہوگئیں ہیں اور ہمیں بنیادی طور پر متاثر کرتی ہیں۔

جیسا کہ ہم سبھی جانتے ہیں کہ موجودہ تہذیب بذات خود عہد وسطیٰ کی مغربی تہذیب سے انحراف کا نتیجہ ہے۔ لیکن عہد وسطیٰ میں ہماری تہذیب مغرب سے مختلف تھی۔ اس طرح اگر جدید تہذیب عہد وسطیٰ کی مغربی تہذیب سے بہت مختلف تھی تو کیا اس کا مطلب ہے کہ ہماری گذشتہ تہذیب اور جدیدیت کے مابین بھی وہی فرق ہے؟ شاید یہی فرق اسلامی اور عیسائی تہذیب وثقافت میں رہا ہے۔

عہد وسطیٰ میں ہماری موجودہ فکر کا زیادہ تر اور سب سے زیادہ اہم حصہ مغرب میں رائج تھا جسے آج مرکزی مقام حاصل ہے چونکہ یہ انسانی زندگی میں خدا کے مطابق ہے۔ اس کے برعکس جدید تہذیب میں انسان کے سیکولر مزاج کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ موجودہ فکر کے اہم معمار مثلاً ڈیسکریٹس (Descartes) جو عہد جدید کے افق پر ابھرا اور جس نے اصولی طور پر خدا اور مافوق الفطرت کا دفاع کیا۔ اس کا نظریہ عہد وسطیٰ کے مسلمانوں اور عیساؤں سے واضح طور پر مختلف تھا۔ انسانوں کے کردار کی مرکزیت کے پیش نظر اہم فرق رونما ہوئے۔

بلاشبہ مغرب میں ہمیشہ سے خدائی، صوفیانہ اور مذہبی فکر کا اثر ورسوخ رہا ہے۔ لیکن کوئی شک نہیں کہ عہد وسطیٰ میں خدا اور مذہب کو مرکزی حیثیت حاصل تھی اور عہد جدید میں انسان اور فطرت مرکزیت کی حامل ہے۔ عہد وسطیٰ میں دیگر دنیاوی مسائل کی قدر و قیمت زیادہ تھی اور مسلم وعیسائی دونوں یکساں تھے۔ لیکن آج کے دور میں حیات بعد الممات کی جگہ سیکولر اقدار نے لے لی ہے۔

عہد جدید میں اٹھارویں صدی کے مغربی عوام کی رجائیت دھندلی پڑ گئی ہے سائنس اور اس سے متعلق ٹکنالوجی ابھی بھی انسانی زندگی کی رہنمائی کے لئے سب سے اہم اسباب ہیں۔ کم از کم معاشرتی دائرے میں عوام مشاہداتی سائنس اور انسانی ادراک پر یقین کرنے کے علاوہ کسی اور چیز کو اس کا مقابل نہیں سمجھتے۔ قدیم زمانے کے انسانوں کا نظریۂ وجود اور نظریۂ سائنس آج کے نظریے سے مختلف تھا۔ علم کی اہمیت کا موازنہ موجودہ دور کے تجرباتی مسائل سے نہیں بلکہ موضوع کی معقولیت سے

کیا جاتا تھا۔ اسی طرح مابعد الطبیعات کی تحقیق اور بالخصوص دینیات کو علم کا سب سے زیادہ اہم شعبہ تصور کیا جاتا تھا۔

سماجی زندگی میں دعویٰ کیا جاتا تھا کہ مذہبی قانون یا مذہبی کتابوں سے جو مفہوم بظاہر سمجھ میں آتے ہیں اسی کی حکمرانی ہونی چاہیے۔ خدائی ''وحی'' کے علاوہ انسانیت کو علم اور تجربہ کے کسی اور وسیلہ کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اسلامی دنیا میں ارسطو اور افلاطون کے نظریہ سے متاثر فلسفہ جو لازمی طور پر جدید فلسفہ اور عقلیت سے مختلف تھا۔ اسے حکمرانوں اور عوام کے درمیان رائج مذہب کے قانونی اور شرعی نقطہ نگاہ کا اور سماج کے زیادہ تر ممتاز افراد اور معاشرہ کے بعض حصوں میں رائج صوفیانہ اثرات کا سامنا تھا۔ اور اس طرح یہ الگ تھلگ اور حاشیہ پر محدود ہو کر رہ گیا۔

عہد جدید کے آغاز کو ایسے وقت سے تصور کر سکتے ہیں جب سائنس اور علم کی اہمیت کا خاص پیمانہ ان کی عملی افادیت ہو گیا تھا۔ حالانکہ اس سے پہلے غالب فکر طبعی دنیا کی احمقانہ حرکت پر قائم تھی۔ اگر چہ اس دور کے مسلم اپنے ہم عصر عیسائیوں سے معقولیت کی شناخت میں آگے تھے۔ اور سچ مچ دونوں تہذیب میں فطری اور طبعی دنیا کی اہمیت کو عام طور پر فضول کا پیشہ تصور کیا جاتا تھا۔

میری دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ آج کی تہذیب ہمارے ساتھ ساتھ غیر مغربی عوام پر بھی غالب ہے اور اس تہذیب کو ایک ایسے کلچر کی ضرورت ہے جو اس سے ہم آہنگ ہو۔ تاہم ہمارے کلچر کا زیادتر حصہ قدیم تہذیب سے ہم آہنگ ہے۔ جدید تہذیب کی بنیاد گذشتہ تہذیب اور اس کے معاون کلچر سے بغاوت پر رکھی گئی تھی۔

اس طرح ہمیں یقینی طور پر یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ روایت سے پُر ہماری تہذیب کے ساتھ جدید تہذیب کا تضاد ہمارے معاشرہ کے بحران کا ایک اہم سبب ہے۔کیا ہمیں اپنی روایت میں منہمک رہنے پر اصرار کرنا چاہیے یا ہمیں مغربی تہذیب میں پورے طور پر ڈھل جانا چاہیے؟ یا اس تضاد کو ختم کرنے کی کوئی دوسری صورت ہے؟ یا کم از کم اسے ایسے رام کرنا چاہیے کہ یہ ہماری تباہی کے لیے مددگار ثابت نہ ہو اور ہماری تاریخی شناخت اور سماجی ساخت کیلئے مضر بھی نہ ہو؟

بہت سے روایت پسند جدیدیت کے برعکس اپنی وراثت کا مسلسل دفاع کرتے ہیں اور وہ اکثر اس وراثت کو خدائی تصور کر لیتے ہیں یہ خیال کرتے ہوئے کہ اس کی وجہ سے مغربی اقدار اور تہذیب کا دروازہ بند کر کے اور روایت پر بھروسہ کر کے ان کی زندگی منظّم ہو سکتی ہے۔لیکن یہی بد بخت سختی ان مقاصد کے حصول میں حائل ہوئی۔ایک حقیقت پسندانہ ثبوت یہ ہے کہ مغربی تہذیب اپنے اقدار کو تلاش کرنے میں روایت سے جکڑا غیر آمادہ سماج جس میں مغرب کو سمجھنے کی صلاحیت کا فقدان تھا اس کے تئیں کامیاب رہی۔اس طرح مغربی تہذیب کے بارے میں اپنے معاشرہ کو معلومات فراہم کئے بغیر روایت پسندوں کے لیے سوائے پیچھے ہٹنے کے کوئی اور چارہ نہ تھا۔

پھر وہ لوگ ہیں جن کا یقین ہے کہ اس بحران کا حل جدید اقدار کو پوری طرح اور غیر تنقیدی طور پر قبول کرنے سے ممکن ہے۔ان کے لیے جدیدیت کا شمار آج تک کے انسان کی سب سے اعلیٰ کامیابی کے طور پر ہے جبکہ ان کا ماننا ہے کہ اسے قبول

کرنے کی ساری رکاوٹیں دور ہو گئیں ہیں۔ روایت کو جدیدیت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم اپنی قدیم وراثت کو ترک کر کے نئی تہذیب کے لیے راستہ ہموار کرتے ہیں۔ لیکن افسوس! بہت سے ایسے لوگ ہیں جن پر مغرب کی بارعب کامیابی سے مسلّم طور پر وجد طاری ہے، ہمارے معاشرہ میں جو لوگ دانشوری کی معروف حیثیت کی روح کے نمائندہ ہیں انھوں نے نہ صرف مسائل کو پیچیدہ بلکہ اور بھی بدتر کر دیا ہے۔

اول، ان کے نظریے کی سطحیت روایت اور جدیدیت کے درمیان تعلق کے سلسلے میں حقیقی بحث کے سامنے آنے میں رکاوٹ بنی ہے۔ دوم، ان روایات کی تقسیم جن کی جڑیں گہری ہیں، ان لوگوں نے خود کو کسی غیر معمولی چیز کو حاصل کرنے میں نااہل ثابت کر دیا ہے۔ ان لوگوں کے لیے ایسے عوام کے دل میں جو روایت کے عادی ہو گئے ہیں کبھی جگہ نہیں ہو سکتی؛ وہ لوگ ایسی زبان استعمال نہیں کرتے جسے عوام سمجھ سکیں ایسے لوگ بالکل حاشیہ پر چلے گئے اور ان کے اقوال کو کبھی شہرت نہیں ملی۔ اس سے بدتر صورت یہ ہے کہ یہ لوگ جینے کے لیے مطلق العنان حکمرانوں کے چکر لگاتے رہے اور اپنے ہی ملک میں مغربی نوآبادیات کا مہرہ بن کر رہ گئے۔

حقیقی زندگی میں نہ مذہبی فرمان اور محض خوش فہمی پر مبنی سوچ مغربی ثقافت کے قدم کو روک سکتی ہے نہ میمورنڈم اور فرمان روایت کی جڑ اکھاڑ سکتے ہیں۔ انسانی زندگی ہمیشہ تبدیلی سے دوچار ہوتی رہی ہے کبھی لاشعوری طور پر تو کبھی بے اختیارانہ طور پر۔ اہم بات یہ ہے کہ کس نظریے سے تبدیلی کے عمل میں اپنی موجودگی برقرار

رکھیں تا کہ ان کے رحم و کرم پر رہنے کے بجائے ذہانت اور شعور کے ساتھ حالات کا سامنا کر سکیں۔

ان دونوں خیالی حل کے ساتھ ساتھ ترقی پذیر دنیا میں کچھ اصلاح پسند دانشور موجود ہیں۔ حالانکہ امید ہے کہ یہ تحریک اور بھی کامیابی سے ہمکنار ہو یہاں تک کہ یہ بھی موجودہ بحران سے محصور ہو۔ اس لئے کہ اصلاح پسند دو اساسیات پر بھروسہ کرتے ہیں؛ ایک، اپنی ذات کی طرف واپسی اور ہماری تاریخی و ثقافتی شناخت کی از سرنو تجدید ،اور دوسرا، انسانی تہذیب کی کامیابی سے مثبت مشاہدہ اس حال میں کہ مغرب کی نو آبادیاتی اور غالب وراثت کا علم ہو۔ نہ صرف یہ کہ ذات جس کی طرف وہ لوگ واپس ہونا چاہتے ہیں اسکی فہم و فراست میں کوئی تال میل ہے بلکہ وہ لوگ مختصر طور پر مغرب کے ان پہلوؤں پر راضی ہیں جنھیں ہمیں اپنے اندر سرایت کر لینا چاہیے۔ اس طرح اصلاح پسندوں کو اولین آباد کار کی حیثیت سے دیکھا جانا چاہیے جنھوں نے بلند ہمتی کے ساتھ معاشرہ کے رنج و محن کا سامنا کرنے کی کوشش کی ہے تا کہ اسے زوال پذیر حالات سے نجات دلائی جا سکے۔

ہمارا ماضی بہت ہی اہم واقعات سے پُر رہا ہے لیکن مستقبل غیر یقینی ہے۔ ہم مغربی کلچر، سیاست، معاشیات اور فوجی طاقت کے رحم و کرم پر ہیں اور ہماری مڈ بھیڑ ترقی کے خیال و نظریہ سے ہے جو مغرب میں ترقی کی تجرباتی شکل ہے۔ ہمیں حتمی طور پر یہ طے کرنا ہوگا کہ مغرب کے تئیں ہمارا رویہ کیا ہے اور کس طرح مغربی اقدار ترقی سے ہم آہنگ ہیں تا کہ ہم مغرب میں ڈھل جانے یا اپنی قومی شناخت کو زک پہنچائے

ایک موقع پر اہل علم کی فہم کچھ اور ہوتی ہے اور دوسرے مرحلہ میں وہ ارتقاء کی منزلیں طے کر لیتی ہے اور اس طرح شاید پہلی فکر و فہم کی نفی ہو جاتی ہے اور نئی فکر اس کی جگہ اختیار کر لیتی ہے۔ اگرچہ انسان کو آسمانی روح سے سرفراز کیا گیا ہے اور وہ فطرت کے ماوراء حدود جو زمان و مکان سے بھی آزاد ہوتا ہے تاہم اس کی محبت، جذبات اور تصورات پھر بھی زمان و مکان کی قیود میں رہتے ہیں۔ اس طرح خدائی کتاب کا بیشتر حصہ زمان و مکان کی قیود کا پابند ہے۔ وہ جنکا خیال ہے ہمارے سمجھنے کے عمل کا کہ وہ خدا، خدا کی کتاب اور مذہب یعنی خاص مذہب کا ادراک رکھتے ہیں اور وہ وقت کی رفتار کے ساتھ بدلنے کو قطعاً تیار نہیں ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی فہم و سمجھ پر تعقل پسندی کو قربان کر دیتے ہیں۔ ان کی فہم و درک بہر صورت زمان و مکان میں مقید ہے۔ اگر ہم مسلمان عظمت خداوندی اور پیغام نبوی کے مطابق ایک بہتر مستقبل کی آرزو رکھتے ہیں، ایک خوشحال زندگی گزارنا چاہتے ہیں اور پوری دنیا کے لئے ایک نمونہ بننا چاہتے ہیں تو ہم کو خدا کی اس بڑی نعمت یعنی معقولیت و تعقل پسندی پر بھروسہ کرنا ہوگا۔

۷۔ ہمارے تشخص کا ہمارے ماضی کے ساتھ گہرا رابطہ ہے لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم اپنے ماضی کی طرف لوٹ جائیں۔ خدا کا پیغام وحی کے ذریعہ ہم پر ماضی میں ہی بھیجا گیا تھا لیکن وہ کسی ایک زمانہ کیلئے نہیں تھا۔ ہمیں اپنے ماضی کا حوالہ دینا چاہیئے کیونکہ ہمارا تشخص ماضی میں ہے لیکن ہمیں ماضی میں ہی نہیں رہنا چاہیئے وہ تو مراجعت ہو جائیگی۔ ماضی کی جانب ہم اس لئے دیکھیں کہ ہمیں آگے

بغیر ترقی کی منزل تک پہونچ سکیں۔ترقی کی طرح ہم عصر دیگر تصورات کی جڑیں مغرب سے ملی ہوئی ہیں۔ یہاں میں اس کی توضیح وتشریح پیش کرتا ہوں۔

''مغربی تہذیب کے اصول اور قدر و قیمت کی بنیاد پر بڑے پیمانے پر فلاح و بہبود کو قائم کرنا۔کیا ہم دنیا کو'ترقی یافتہ' جس کا مطلب مغربی اقدار پر قائم ہے اور غیر ترقی یافتہ کے دوخانوں میں تقسیم کرتے ہیں؟ کیا ہم ان ممالک کے بارے میں نہیں سوچتے جو ابھی ترقی پذیر ہیں اور مغرب کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنی زندگی کے معیار کی تجدید کی کوشش میں لگے ہیں؟ یہاں جدیدیت اور روایت کے درمیان رشتہ سامنے آتا ہے''

''ترقی'' ایک مغربی تصور ہے جس کی بنیاد مغربی تہذیب پر ہے۔اسے بغیر جانے ہم ''ترقی'' کو سمجھ نہیں سکتے ہیں۔اس کے بارے میں طے ہونے دیں یا اسے مسترد کرنے دیں۔اس لئے مجھے یقین ہے کہ ''ترقی'' کے بارے میں بحث کرنا قبل از وقت ہوگا۔

کچھ لوگ دعوی کرتے ہیں کہ قوم کو پسماندہ ہونا ہی ہے جب تک انکی ترقی کی ساری ضروریات پوری نہ ہو جائے۔ان کے مطابق جدیدیت ''ترقی'' حاصل کرنے کیلئے ضروری ہے۔

مذکورہ فیصلہ صحیح ہے اگر ہم مغربی تہذیب کو متبادل کے طور پر تسلیم کرتے ہیں جو ممکن نہیں ہے۔لیکن کچھ لوگ مغرب کو جدید ترین نہ کہ متبادل انسانی تہذیب تصور کرتے ہیں جو دوسرے تمام کاریگری کے مانند ہے، جو آزمائشی ہے اور جس کے زوال کی

گنجائش ہے۔ یقیناً اس کا مطلب ترقی سے انکار یا ہتھیار ڈالنا نہیں ہے پسماندہ اصلاح پسندوں کے سامنے اس کا مطلب ان لوگوں کے نسخوں کو مسترد کرنا ہے جو وسیع پیمانے پر پورے طور سے مغربیت کی بات کرتے ہیں۔ عام طور پر دانشوروں کے نسخے ان لوگوں سے مختلف ہوتے ہیں جو معاشروں کے ممتاز افراد ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں اور بھی ترقی پورے طور پر حاصل کی جائے گی اگر پالیسی بنانے کا عمل معقول فکر سے مناسبت رکھتا ہے نہ کہ فکر کی پابندی سے۔

سب سے پہلے ایک دانشور کی حیثیت سے ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اگر ترقی کا مطلب مغربی تجربات کا اعادہ کرنا ہے تو ہمیں ابھی بھی اس کے بنیادی اصول اور ان کے نفاذ کو سمجھنا پڑے گا۔ ایسا کرنا حقیقی فکر وفہم کو اہم دعوت دینے کے مترادف ہوگا۔ سچ تو یہ ہے کہ عقلیت پسندی کے بغیر ''ترقی'' کا حصول ممکن ہی نہیں ہے۔

اول، ترقی ایک میکانیکی عمل نہیں ہے جسے عقلیت پسند انسانوں کے بغیر حاصل کیا جاسکتا ہے۔ دوم، جو معاشرہ عقل پر مبنی افکار سے خالی ہو وہ اپنا توازن کھودے گا جیسے ہی اسے مشکلات کا سامنا ہوگا۔ یہ بالکل واضح ہے کہ انسانی مشکلات کو طاقت ،سخت قوانین اور سیاست دانوں کے فرمان سے دور نہیں کیا جاسکتا اگر چہ کچھ دیر کے لئے ان وسائل سے مشکلات دور کی جاسکتی ہیں۔

درحقیقت مغربیت کے متوالوں اور ''روایت پرستوں'' کا افسوسناک مشاہدہ وتجربہ ہمارے سامنے ہے، ہمیں ان غلطیوں سے سبق سیکھنا چاہئے تاکہ ان کا اعادہ نہ ہو۔

جدید تہذیب ہمارے عہد کی اہم حقیقت ہے اس نے انسانیت کو یادگار فوائد سے ہمکنار کیا ہے ساتھ ہی اس کے نقصانات بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ یہ نقصانات مغربی جغرافیائی سرحدوں کے باہر اہل مغرب کے ذریعہ کئے جانے والے سیاسی اور اقتصادی مظالم کی حد تک محدود نہیں ہیں۔ مغرب اپنے معاشرتی، اقتصادی اور فکری شعبوں میں بیشمار اندورنی بحران کا شکار ہے ہم میں سے وہ لوگ جو مغرب کے باہر زندگی بسر کررہے ہیں، اگر مغلوب محسوس نہ کریں اوراس کے جال میں نہ پھسیں تو کم ازکم ان مصیبتوں کواچھی طرح سمجھ سکتے ہیں جو غیر مغربی عوام کے لئے مغربی نوآبادیائی نظام کی دین ہے۔

مغربی تہذیب انسانی ساخت ہے اس لئے غیر مستقل ہے اوراس کے زوال کی گنجائش ہے۔ جب تک کہ کچھ لوگ غیر حقیقت پسندانہ دعوی نہ کریں کہ جدید تہذیب کی صبح کے ساتھ انسانی تجسس کا سر چشمہ اور تخلیقیت خشک ہوگئیں ہیں ۔تہذیب ان لوگوں کی تجسس کا جواب ہے جو دنیا پر سوال اٹھانے سے تھکتے نہیں ہیں۔ انسانوں کی ہمیشہ بدلتی ہوئی ضروریات انھیں ان ضروریات کو پورا کرنے کے لئے مجبور کرتی ہیں۔تہذیب ان سوالوں کا جواب ہے جو کسی کو درپیش ہوتا ہے۔یقیناً کچھ اہم سوالات اورضروریات ہیں جو تہذیبوں کے عروج میں مددگار ثابت ہوئے ہیں اور یہ سوالات بذات خود وقت اور جگہ سے متاثر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تہذیبیں بدلتی رہتی ہیں اور یہ کوئی ناقابل تبدیل شئے نہیں ہوتی نہ ہی دائمی تہذیب کا تصور ہے۔ کیونکہ جب تک انسان ہیں اس وقت تک ان کی تجسس اورضروریات بھی ہیں۔ ہر

سوال کا جواب ہوتا ہے اور سبھی ضرورتوں کی تکمیل ہوتی ہے۔ ہمیشہ نئے نئے سوالات اور نئی ضروریات انسان کے سامنے آتی ہیں۔ ہر تہذیب اسی وقت تک قائم رہتی ہے جب تک وہ انسانی سوالات کے جواب دینے اور انسانی ضرورتوں کو پورا کرنے کی اپنی باطنی قوت کو برقرار رکھتی ہے۔ لیکن باقی سیکولر چیزوں کی طرح تہذیب کی بھی ایک حد ہے۔ جب یہ اپنی قدرتی طاقت کو ضائع کر دیتی ہے اور نئے سوالوں کے جواب نہیں تلاش کر پاتی ہے تو آہستہ آہستہ اس کے پیروکاروں کا exuberance ناپید ہو جاتا ہے۔ اسی طرح تہذیب تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔

مغربی تہذیب نے انیسویں صدی کی شروعات سے لے کر بیسویں صدی کے دونوں عالمی اشتراکی مخالفین جنگوں تک بڑے بڑے بحران کا سامنا کیا ہے اور اپنی قدرتی طاقت کے سہارے ہی ان پر قابو حاصل کر سکی ہے۔ لیکن اعتدال پسند مغربی سرمایہ دار اپنے ادارہ کو موافق کر کے اپنے سماجی حریف سے لڑنے اور اپنے کو بچانے میں کامیاب رہا ہے۔ سوشلزم اشتراکیت کے خاتمہ نے، جو اس کی اندورونی کمزوریوں کی وجہ سے ہوا، ساری دنیا کو حالت استعجاب میں ڈال دیا پھر بھی یہ صاف ہے کہ مغرب دوسرے بڑے بحران سے پریشان ہے۔ یہ بحران مغرب کی اہم اقدار کو زیر سوال قرار دیئے جانے کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں جو ان کی اپنی صلاحیت صلاحیتوں اور بھروسے اور اس کے بھروسے میں رونما ہونے والی کمی سے صاف ظاہر ہو رہا ہے۔ یہ سوال پہلے سے زیادہ زور دار اور اہم ہو گئے ہیں۔ اس لئے مغرب کی اخلاقی اور فلسفیانہ بنیادوں پر اعتراض آج زیادہ عام بات ہو گئی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ انسانی تجسس اور ضرورتوں کا جواب دینے میں عہد وسطیٰ کی ناکامی اور ان سوالوں اور ضرورتوں کو دبانے کے لئے طبی اور نفسیاتی طاقت کا استعمال کرنا ایک دانشورانہ اور سماجی دھماکہ کا ذریعہ بنا جس نے چرچ اور جاگیرداروں کی حکومت کو تباہ کر دیا۔ لیکن ان شعوری سوالوں اور ضرورتوں کو ہی جدید تہذیب کے عروج کی تنہا وجہ مان لینا بے وقوفی ہوگی ۔ یہ سوالات اور ضرورتیں ان ترغیبوں سے ابھر کر آئی ہیں جو منطق اور عقلیت کے دائرے سے باہر تھے۔

اول، چرچ اور جاگیرداری کے طرف سے نافذ کی گئی سخت پابندیوں نیز خود جاگیرداری نے مخالف سمت میں ردعمل کو اجاگر کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ چرچ نے اپنے اصولوں اور طور طریقوں کو تقدیس کا جامہ پہنا دیا تھا جس کی زیادتی نے مغرب کے عوام کو نہ صرف موجودہ سماجی نظام کو ختم کرنے پر مجبور کیا بلکہ مذہب اور روحانیت کی پوری معقولیت پر شک کرنے کا موقع فراہم کر دیا۔ مادہ پرستی اور لالچ نے اس جدید تہذیب کے فروغ میں اہم رول ادا کیا جس نے درحقیقت بڑی سچائیوں اور روحانیت کو کچل ڈالا ہے۔

کیا جدیدیت کی ترقی میں بورژوا کا رول اس تحریک کی بنیاد ڈالنے والوں سے کم اہم تھا؟ بورژوا طبقہ کو جو طاقت اس تحریک میں آگے بڑھا رہی تھی وہ اس کی سچائی اور عدل کی بے چین کر دینے والی کھوج نہ تھی اور نہ ہی ان دو مقصدوں کو چرچ اور جاگیرداری سے بچانے کی آرزو بلکہ دولت حاصل کرنے کی چاہت تھی۔

آزادی، بھائی چارگی اور برابری فرانسیسی انقلاب کے بنیادی وعدے تھے

لیکن یہ وعدے نئے دولت مند اور بے تحاشہ آرزوں کے حامل بورژوا طبقے کے اوزار اور آلۂ کار تھے جنہیں وہ مطلق العنیانیت کے ساتھ طاقت کی لڑائی میں استعمال کرتا تھا۔ یہ دعوی کرنا بھی ممکن ہے کہ جدیدیت کے سائنس داں اور دانشور، اصل میں نئے طبقے کی چاہتوں اور آرزوؤں کی عاقلانہ اور دانشوارانہ توجیہ پیش کرر ہے تھے۔

جب ہم مغربی تہذیب کی مختلف النوع نعمتوں اور برکتوں مثلاً جدید سائنس، ٹکنالوجی، فکر کی آزادی اور جمہوریت کی تعریف کرتے ہیں تو ہم نوآبادیت غیر مغربی لوگوں پر جان لیوا طاقت کا استعمال، دوسرے ملکوں کے لوگوں کی جان و مال اور ثقافتی فراوانی کی بربادی، زمین پر ماحولیات آلودگی، جھوٹ کو سچ بنانے کی کوشس، اور موقع پرستی کو نظر انداز نہیں کر سکتے کیونکہ یہ چیزیں بھی مغربی تہذیب کی خصوصیات میں شامل ہیں۔

اس لئے ہم ہر اس چرچ کے سامنے ہتھیار نہیں ڈال سکتے جو مغربی ہو۔ اسی طرح ہم روایت کو بھی سطحی طور پر نہیں پرکھ سکتے: روایت لوگوں کے سماجی و تاریخی ماحصل کی روح رہی ہے، خاص طور پر ہم لوگوں کے لئے اس کی بہت اہمیت ہے کیوں کہ ہم لوگ غنی ثقافت اور تاریخ کے حامل تھے۔ جیسا کہ ارسطو اپنی کتاب سیاسیات میں کہتا ہے کہ فطرت اور روایت ایک اچھے سماج کو متحدر کھنے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔

روایت سے الگ ہونے کا مطلب ہے عوام کی ثقافت اور تاریخی وراثت کی بربادی لیکن اگر ایک قوم کے لوگوں کو ارتقائی مرحلہ طے کرنا ہو تو انھیں اپنے ماضی کو

ضروری طور پر سمجھنا ہوگا جس سے انھیں احساس ہو کہ تاریخی ارتقا کے عمل میں وہ کہاں اور کس منزل پر ہیں۔ اس لئے، روایت کے جن پہلوؤں کو ہمیں نکال دینا ہے ان کی بنیاد گھریلو ماڈل پر ہونی چاہیئے۔ حقیقت یہ ہے کہ مغربی قوم جدیدیت کے بالکل ابتدائی مرحلہ میں اپنی روایت کی گہرائی میں جاکر بیدار ہوئی۔ دانشوروں نے یونانیوں کی فنکارانہ روایت اور روم کی سماجی روایت کو پھر سے سمجھنے کی کوشش کی۔ مذہبی یقین کرنے والے عیسائی مذہب کی طرف دیکھنا شروع کیا جسے وہ سب سے زیادہ معتبر مانتے تھے اور اس طرح نئے دور کا آغاز ہوا۔ روایت کی طرف پھر سے دیکھنے اور اسے نئے طریقے سے سمجھنے کی وجہ سے ایک نئے عہد کا آغاز ہوا۔

ایسے زمانے میں بورژوا طبقہ نے، جس کو سیکولر دانشوروں کی مدد حاصل تھی، نئی فکر کی وجہ سے فتح حاصل کی۔ یہ فکر معقول عقل کے پچھلے طریقوں کی واپسی پر ٹکی تھی۔ اس لئے روایت شکنی کی کوشس میں بھی روایت کو بھولنے کی بات نہیں ہے۔ اگر ہم ارتقا کی خواہش رکھتے ہیں اور تقدیر کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لینا چاہتے ہیں جس سے اسے تبدیل کر سکیں تو ہمیں اس بات سے مطمئن ہونا پڑے گا کہ ترقی کے مغربی ماڈل کے پیچھے بھاگنا ہماری وراثت کو برباد نہ کر دے۔ ہم روایت کی تنقید صرف اسی وقت کر سکتے ہیں جب ہمیں اپنی شناخت کی مضبوط سمجھ ہو۔ غیر روایتی لوگ مختلف سنجیدہ فکر سے محروم رہ جاتے ہیں۔ وہ کمزور خواہش والے اور غیر مستحکم ہونے کی وجہ سے حالات کی مرضی پر جیتے ہیں۔

اس کے علاوہ ایک تجرباتی مسئلہ یہ ہے کہ انسانی زندگی میں روایت کی جڑیں

اتنی گہرائی تک پھیلی ہوئی ہیں کہ سیاست دانوں کے ذریعہ صادر کیے فرامین یا دانشوری کے عالمانہ بیانات کے ذریعہ انھیں ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے بھی بدتر یہ کہ اس عمل کو جبراً آگے بڑھانا حقیقت میں مسائل کو اور بڑھا سکتا ہے اور سماج کی شناخت کو برباد کر سکتا ہے۔ لیکن یہ روایت کے سامنے بے شرط ہتھیار ڈالنے جیسا نہیں۔

روایت، بہت حد تک تہذیب کی طرح ایک انسانی بناوٹ ہے اور اس میں تبدیلی کا امکان رہتا ہے۔ پوری تاریخ میں روایتوں کا مختلف رفتار سے مسلسل تبدیل ہونا اس بات کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ آگے بھی تبدیلی ہونی طے ہے اہم مسئلہ یہ ہے کہ تبدیلی کا عمل کس حد تک شعوری طور پر شروع کیا گیا ہے اور اس عمل میں زیادہ سے زیادہ لوگ از خود شرکت کے متمنی ہیں بجائے اس کے کہ اسے اوپر سے چلایا جا رہا ہے یا حالات نے عوام کو اس عمل میں شرکت کے لئے کو مجبور کر دیا ہے۔

روایت کی ترقی و تبدیلی بہر حال یقینی ہے۔ یہ سوال اٹھتا ہے کہ روایات کو بنائے رکھنے کے لئے کیا عوام پر زور زبردستی کی جا سکتی ہے چاہے انسانی راہ و روش زندگی کی ضروریات، خواہشات اور مطالبات مختلف کیوں نہ ہوں؟ اپنی ضرورتیں اور خواہشیں ہیں۔

روایت انقلاب پسند عوام کی سمجھداری اور وجدان پر منحصر ہے۔ یہ تبدیلی مکمل ہونے کے وجود کو انکار نہیں کرتی بلکہ صرف اس بات کو محسوس کرنے کی ضرورت پیدا کرتی ہے کہ وقت کے ساتھ کامل ہونے کے بارے میں ہماری ترجمانی میں تبدیلی آئے۔ کیا انسان کی سمجھداری خدائی معاملوں میں تاریخ میں ہمیشہ ایک ہی جیسی رہی

ہے؟

اہم نقطہ یہ ہے کہ جب کسی سماج اور عوام کی تاریخی یادداشت میں معنی ومفہوم گہرائی میں داخل ہو جاتے ہیں اور ایک مدت کے بعد وہ انسانی ذہن وسماج میں وہ اتنی مضبوط جگہ بنا لیتے ہیں کہ ان سے منھ موڑنا مشکل ہو جاتا ہے اور یہ مشکل تب اور بڑھ جاتی ہے جب اس روایت پر تقدس اور پاکیزگی کی ایسی تہہ جم جاتی ہے کہ ان عادتوں اور معنی ومفہوم پر کی جانے والی کسی بھی تنقید یا اعتراض کو بے حرمتی سمجھا جاتا ہے۔ بے حرمتی سے لڑنا ایک خدائی فرض ہے جو مذہبی سماجوں میں روایت کی تنقید کو اور مشکل کر دیتا ہے۔

یہ یقینی طور پر صحیح ہے کہ فکر اور زندگی کے طور طریقوں میں تبدیلی ضروری ہوتی ہے جب تک ہم روایت کو تبدیل کرنے اور اسے آج نئے طریقے سے تعمیر کرنے میں متحرک طور پر شرکت نہ کریں وہ زیادہ تر ترقی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہوتی ہے۔

ہمارے سماج کو ارتقاء اور تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ہمیں یہ پتہ ہونا چاہئے کی ترقی اپنے مغربی مفہوم میں تبدیلی کی صرف ایک شکل ،جسکی اور بھی شکل ہو سکتی ہے۔ غرب میں ترقی کی روایت اور تاریخی سمجھ پر منحصر ہونے کا انجام ہے جس نے مغربی عوام کے بیچ انسان اور وجود کے بارے میں نئی سمجھ پیدا کر دی ہے۔

مغرب کے عوام نے ایک لمبے اور مشکل مرحلہ کو پار کیا ہے۔تمام اتار چڑھاؤ کو دیکھنے کے بعد ہی انہوں نے مبنی بر عقل فلسفیانہ افکار اور مقصد کو حاصل کیا ہے۔

سچائی کی کھوج اور مقابلہ، ظہور اور آرزو نے مل کر جدیدیت اور ترقی کو وجود کے ذریعہ سے آراستہ کیا ہے۔

ہم لوگ ایسے وقت میں جی رہے ہیں جب مغرب کی اندرونی کمزوریاں نہ صرف مغرب سے باہر رہنے والوں کو دکھائی دینے لگی ہیں بلکہ مغرب کے عوام بھی اب ان خرابیوں اور کمزوریوں سے بخوبی آشنا ہیں اور اسی وجہ سے ان لوگوں کو اب اپنی شاندار واضح تقدیر پر شک ہونے لگا۔ اسے جاننے کے بعد ہمیں اپنی ترقی کے لئے مغربی قوم کو مکمل طور پر نہیں اپنانا چاہئے اور اسی طرح ہم روایت کو ناقابل شکست یا خدائی چیز کی شکل میں نہیں دیکھ سکتے۔

اس لئے ہم لوگوں کو دو اہم انسانی مسائل کا مقابلہ کرنا ہے۔ ان میں سے ایک مسئلہ کی جڑئیں ہمارے سماج کی گہرائی تک پھیلی ہوئی ہیں اور دوسرے مسئلہ کو باہر سے لاکر ہمارے اوپر تھوپ دیا گیا ہے۔ اور یہ درآمد شدہ مسئلہ کچھ اور نہیں بلکہ نئی تہذیب ہے جو کئی معنوں میں ہمارے اوپر غالب ہے۔ یعنی جدید تہذیب کی اہم بات یہ ہے کہ ہمیں ان میں سے کسی کی بھی خلاف ورزی نہیں کرنی ہے جیسا کہ کچھ لوگوں نے کیا ہے۔

آج کو سمجھنے کے لئے ہمیں آنے والے کل کے مطالبات کو جاننا ضروری ہے اور مستقبل کو سمجھنے کے لئے اپنی تاریخ سے واقف ہونے کے علاوہ ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں ہے۔ آنے والا کل وہ وقت ہوگا جب انسانیت آج کی تہذیب کو پار کر چکی ہوگی اور وہ جو وہاں پہلے پہنچیں گے وہ بہرحال اپنے ماضی سے واقف ہوں گے اور

مستقبل کی جانب چھلانگ لگانے کے لئے ایک تختہ فراہم ہو جائے۔

۸۔ مستقبل کی جانب آگے بڑھتے ہوئے ہم آج کی دنیا کو پورے طور پر سمجھیں اور انسانی تمدن اور افکار کی مثبت کامیابیوں سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں وہ خواہ کہیں بھی ہوں۔ صرف اس طریقہ کار سے ہی ہم اپنے ماضی کی عظمت اور شان کو دوبارہ زندہ کر سکتے ہیں۔ اپنے حال اور مستقبل کو سامنے رکھتے ہوئے زندگی کا ڈول ایسا ڈالا جائے جس میں روحانی صفات اور الہام ہو لیکن اس کے ساتھ انسانی تعقل پسندی اور انسانی حقوق کا پورا احترام کیا جاتا ہو۔

۹۔ ایک اور خراب صورتحال وہ ہے جس میں مذہب اور آزادی کو ایک دوسرے کا مدمقابل اور مخالف بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ قرون وسطی میں مذہب کو تعقل پسندی اور آزادی کے خلاف سمجھا جاتا تھا --- نتیجہ میں دونوں کا نقصان ہوا --- آج کے آزادانہ ماحول میں پوری آزادی موجود ہے لیکن ایک ایسی آزادی جو روحانیت سے مبرا ہو اور انسانی زندگی کے روحانی عناصر سے دور ہو۔ نتیجہ کے طور پر موجودہ زندگی گوناگوں مشکلات سے گھر گئی ہے جس کا اعتراف خود اہل مغرب نے کیا ہے۔ مذہب بغیر آزادی کے غلامی کی زندگی بلکہ ایک ایسی زندگی کا مترادف ہے جو وقار اور عزت سے عاری ہو، سچ تو یہ ہے کہ مذہب تعقل پسندی، آزادی اور حریت کی پرورش کرتا ہے اور پورے طور پر ان کی مدد کرتا ہے۔ خدائی مذہب نے ہی ہمیں یہ بتایا ہے۔ ان معیاروں اور ایسے بہت سے دوسرے عناصر پر بھروسہ کرتے ہوئے ''تمدنوں کے درمیان گفتگو'' کرنے کی تیاری کرنی چاہیئے اور دنیا کو اپنے مذہب اور تمدن کی شاندار

مستقبل ان کی خصوصی توجہ کا مرکز ہوگا۔ وہاں وہ لوگ پہلے نہیں پہونچ سکتے جو روایت کے بندھن میں بندھیں ہیں یا ایسے سطحی اور ظاہری جدیدیت پسند ہیں جو عصری تہذیب کے ظاہری خدوخال کو ہی اصلی تہذیب سمجھتے ہیں۔

کیوں نہ ہم آنے والی تہذیب کی طرف متوجہ ہو جائیں اور ساری تبدیلیوں کو اس تہذیب سے اس طرح ہم آہنگ کرلیں کہ وہ اعلی معیار رونمونے کے مطابق ہوں۔ ایسے حوصلہ مند منصوبوں کے لئے ضروری ہے کہ ہم جدیدیت اور روایت کو تنقیدی نگاہ سے دیکھیں۔

درحقیقت مستقبل میں جانے کا مطلب حال سے بغاوت ہرگز نہیں ہے۔ صرف وہی لوگ جو ترقی بیداری اور جرأت مندی کی سطح تک پہنچتے ہیں جو انسانی زندگی کی ساری کامیابیوں کو شامل کرنے کے اہل ہوتے ہیں یہی وہ افراد ہیں جو ایک نئے دور کی تعمیر کر سکتے ہیں اور مستقبل کے مالک بن سکتے ہیں۔

یہ ضروری نہیں کہ ہم جدید تہذیب میں ضم ہو جائیں لیکن ہم نئی تہذیب کے سایہ میں رونما ہونے والی بہت سی سائنسی، سماجی اور سیاسی کامیابیوں کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ کیا ہم لوگ ایک نیا رشتہ قائم کرنے اور ایک نیا تصور حاصل کرنے کے لئے موجودہ دور کو عبور نہیں کر سکتے اور اس کے زیر سایہ ایک ایسی نئی تہذیب جس کا احساس ہماری قومی شناخت پر ہو وسیلہ نہیں بن سکتے ہیں؟ کیا جدید تہذیب کی کامیابیوں سے استفادہ کر کے انسانی زندگی میں ایک نئے باب کی شروعات نہیں کر سکتے ہیں؟ خاص طور پر ہم ایرانیوں اور مسلمانوں کے لیے خوش آئند ہے کیونکہ

ہمارے پاس ایسی تہذیبوں کی تعمیر و تشکیل کا دستاویزی ثبوت موجود ہے جو انسانی تاریخ میں نمایاں کردار کی حامل رہی ہیں۔ کیا ہم لوگ ایک بار پھر تہذیب کے خالق نہیں ہو سکتے ؟ کیوں نہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہمیں زندگی بسر کرنے کے لیے ماضی میں لوٹ جانا چاہیے۔ لیکن ہمیں ایک ایسے محفوظ زمین کی تلاش کرنی ہوگی جہاں سے حال کے پرے اور ایسے مستقبل کی طرف پیش قدمی اختیار کی جا سکے جو ہمارے ماضی اور حال دونوں پر منحصر ہے۔

دسواں باب

آزادی اور ترقی

آزادی اور ترقی

دارالفنون، اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے ایران کا پہلا تکنیکی اسکول ہے جس کا افتتاح نصیرالدین شاہ کے ہاتھوں ۵ربیع الاول ۱۲۶۸ھ (October 27, 1851) میں ہوا۔اس واقعہ کے نتیجے میں 'ترقی' کا آئیڈیا پیدا ہوا جسے آج ہم ایرانی دیکھ اور سمجھ رہے ہیں۔ اسکول کی تاسیس کے ڈیڑھ سو سال بعد 'ترقی' کی توضیح وتشریح کرنے اور اسے حاصل کرنے کے طور طریقوں کے بارے میں سوالات کا کھڑا ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ ہمیں ترقی حاصل نہیں ہوئی ہے۔پس یہ معلوم کرنا نہایت ضروری ہے کہ آخر ترقی حاصل نہ ہونے کی وجہ کیا ہے؟

یہاں ہم ثقافتی ترقی کے پیچیدہ تصورات کا ذکر نہیں کرنا چاہتے۔ مجھے امید ہے کہ ہمارے معاشرہ میں موجود مشہور ومعروف دانشوروں کی فکر اور تصور کے نتیجہ میں ترقی کے مفہوم کی پیچیدگیاں ختم ہو جائیں گی۔ میں ترقی کی اولین ثقافتی شرط پر نہ کہ ترقی کے مفہوم پر ایک عام بحث کرنا چاہتا ہوں۔ میرے خیال میں ترقی معاشرہ میں مطلوبہ اور مناسب تبدیلی کی ایک شکل ہے۔ عصری معنی ومفہوم کے مطابق ترقی محض تبدیلی کی ایک شکل ہے۔ یہاں تین نکات پر غور وفکر کرنا لازمی معلوم ہوتا ہے۔

اول کوئی بھی تبدیلی انسانی اور تخلیقی وتولیدی صفات کی حامل نہیں ہوگی جب تک عوام اپنی رضا ورغبت کے ساتھ اس تبدیلی کے عمل میں شریک نہ ہوں۔ دوم، ترقی کے عمل میں انسانوں کی عملی شرکت کے لئے ضرورت ہے کہ معاشرہ کے زیادہ تر حصوں میں سنجیدہ اور تسلیم شدہ افکار ونظریات سوم، معاشرہ میں مستحکم اور تخلیقی فکر کی بنیاد سب سے پہلے آزادی پر ہونی ضروری ہے۔

اس طرح ہم کہیں بھی مثبت تبدیلی کی امید اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک آزادی کی تمنا پوری نہ ہو جائے۔ یعنی سوچنے کی آزادی اور کسی بھی نئ فکر کو اظہار کرنے کا تحفظ جس کو اظہار خیال کی آزادی کے نام سے بھی یاد کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ''ترقی'' ایک مغربی ساخت ہے اور وہ تمام لوگ جو ''ترقی'' چاہتے ہیں ان کے لئے موڈرن ہونا ضروری ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ترقی کی ابھی جو وضاحت کی گئی ہے وہ جدید تہذیب کے درخت کی ایک شاخ ہے۔ اگر وہ تہذیب آئے گی تو ترقی بھی رونما ہوگی، درحقیقت جو لوگ یہ دعوی کرتے ہیں کہ مغربی افکار واقدار کو قبول کرنا ترقی کی پیشگی اور ضروری شرط ہے وہ گمراہ نہیں ہوتے ہیں۔ مغربی فکر اور معقولیت کے ساتھ مغربی افتاد طبع اور اخلاق کو قبول کرنا ضروری ہے۔

لیکن میں اس بات پر بھی یقین رکھتا ہوں کہ ''ترقی'' جیسا کہ موجودہ دور میں سمجھا جاتا ہے انسانی معاشرہ میں صرف ارتقاء اور تبدیلی کی ایک شکل ہے نہ کہ اس کا مخصوص تصور۔ یقینی طور پر اس تبدیلی اور ارتقاء کی وجہ سے انسانیت کو بہت فائدہ پہونچا ہے لیکن میرا یقین ہے کہ اس سے بہت نقصان بھی ہوا ہے۔ مغربی تہذیب

اس کے تصور ترقی کو دیکھنے میں بہت سی تباہی و بربادی کی حامل حقیقتوں کو پوری طرح نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ ہم جس ''ترقی'' کے بارے میں آج بحث کر رہے ہیں اس کے لئے چار سو سال پیچھے نہیں جا سکتے جب مغرب نے ترقی کی موجودہ حیثیت کو حاصل کرنے کے لئے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔ اس کے بجائے ہمارے سامنے مغربی عوام کے وسیع تجربات ہیں۔ اور اگر ہم صاحب فکر ہیں تو ہم اپنے مستقبل کی راہ اس تجربے کی بنیاد پر منتخب کر سکتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ ہمیں مغربی تجربوں کی طاقت وصلاحیت اور کمیوں کو سمجھنا پڑے گا تا کہ ایک بہتر اور زیادہ مناسب انتخاب عمل میں آسکے۔

نشو ونما اور ترقی کی موجودہ خصوصی شکل کی تردید کا مطلب جدید تہذیب کی حقیقتوں سے انکار کرنا نہیں ہے اور کوئی بھی یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ جو سماج آگے بڑھنا چاہتا ہے اس کے لئے اس وقت تک کوئی معجزہ رونما ہونے والا نہیں جب تک اس سماج کے لوگ مغربی تہذیب کی کامیابیاں کو فریب دینے کے بجائے انھیں اپنے اندر ضم نہیں کر لیتے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم مغربی تہذیب سے آشنا ہوں تا کہ اس کی روح سے واقفیت حاصل کی جا سکے اور مغربی تہذیب کی روح سے قربت ہی جدیدیت ہے۔ وہ لوگ جو اسکی روح سے واقف نہیں ہیں کبھی اپنی زندگی میں مثبت تبدیلی کو مؤثر کرنے کے قابل نہیں ہونگے۔ اس طرح تبدیلی کا خاص اصول مغرب کی اس شناسائی کا مقصد جدیدیت کے خاص اصولوں کو سمجھنا ہے جو بہت سے عقائد کے پیچھے پوشیدہ ہے۔ افسوس، اقوام مثلاً ہم لوگوں میں ابھی بھی ایسی سمجھ کی کمی ہے۔ جیسا

کی عبداللہ حایری نے کہا ہے، ہم لوگوں کو ابھی مغربی تہذیب کے دو تیوروں سے واقفیت حاصل کرنا ہے۔ مغرب کے ساتھ ہماری مڈبھیڑ نہایت ہی سطحی رہی ہے۔ ہم لوگ دوستوں کے مابین متذبذب ہیں۔ یا تو مغرب کا وجد طاری ہے یا اس سے نفرت اور انکار۔

میرے خیال میں ترقی کی بحث کو مغربی تہذیب پر بنیادی نگاہ ڈالنے کی ضرورت ہے کہ مغربی تہذیب کیا ہے اور ان دونوں کے درمیان کیا واسطہ ہے اگر یہ بحث سنجیدگی سے شروع ہوتی ہے تو ترقی کی بحث اور بھی زیادہ تیزی اور قطعیت کے ساتھ آگے بڑھے گی۔

ایسا کیوں ہے کہ دارالفنون (ایران میں جدید سائنسی اسکول کی ماں) کی تاسیس کے ڈیڑھ سو سال بعد بھی اسی سوال میں گھرے ہیں کہ ترقی کیا ہے اور ہم نے اسے کیوں حاصل نہیں کیا؟

اس اہم سوال کا جواب دینے کی کوشش دوسرے تاریخی حکایت سے جوڑ کر شروع کرنی ہوگی۔ جمعہ کے دن ۷ ربیع الاول ۱۲۶۸ ہجری (Nov 9,1851) کو دارالفنون کو افتتاح کے صرف بارہ دن بعد نصیرالدین شاہ نے امیر کبیر۔ وہی آدمی جس کی فکر اور دانشوری کی بدولت اسکول وجود میں آیا تھا۔ کو کاشان شہر کے فین حمام میں موت کے گھاٹ اتروا دیا۔ میرے خیال میں ہماری بیقراری کا راز اسی میں پوشیدہ ہے۔

ہماری صدیوں کی تاریخ پر اس ملک کے لوگوں کی فہم و فراست اور کوشش کی

حکمرانی نہیں رہی ہے بلکہ استبدادی اور خبطی حکمرانوں کی بالا دستی رہی ہے۔ اور خود مختاری و مطلق العنانیت کو ہماری سوسائٹی میں مرکزی کردار حاصل رہا ہے۔ جس کی وجہ سے ہمارے عوام کو خود اپنے ہی معاشرے میں سرگرم فعال ہونے کا موقع نہیں ملا ہو۔ فکر کی آزادی کو جو انسانیت کی سب سے اعلی علامت ہے نجی زندگی میں فعالیت اور نشو و نما کے لئے خاص طریقے کی عزّت نہیں دی گئی ہے۔ باالفاظ دیگر، ہماری عظیم تاریخی مشکلات کے اسرار، فارابی کے مطابق، ہماری تقدیر پر عیاری اور فریب کا غلبہ رہا ہے۔ ایک ایسا فریب جس کی جڑیں اسلام کے آغاز سے قبل بہت گہری ہو چکی تھیں۔ ماقبل اسلام ساسانی ایران میں وسیع پیمانے پر بدعنوانی نے ملک کو بربادی کے دہانے پر لا کھڑا کر دیا تھا۔ اسلام کے آتے ہی مکر و فریب کی بنیادیں ہلنے لگیں لیکن محض اسلام کے آنے کے بعد صرف چالیس سال، دور خلافت راشدہ نے مطلق العنانیت کی اور بھی خطرناک شکل مسلمانوں کی تقدیر پر حکمرانی کرنے لگی۔ چونکہ اس وقت مطلق العنانیت اور ظلم و زیادتی اسلامی قانون کے بھیس میں تسلیم کر لئے گئے تھے۔

جیسے ہی اسلامی تہذیب نے ساسانی فارسی تہذیب یا دوسری تہذیبوں کی جگہ حاصل کی، اور یہ امید کی گئی کہ ان تہذیبوں کے سیاسی منشورات بھی تبدیل کر دیا جائے گا۔ خاص طور پر اسلامی تہذیب کی شروعات میں نئے سیاسی ماحول سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں۔ تصورات کو قانونی شکل دینا مثلاً اجتماعی طور پر فیصلہ کرنا، مصالحت اور مفاد عامہ کے غلبہ کو بذات خود حضرت پیغمبر اکرم (ص) کسی حد تک ان

کے اصحاب کے قول وفعل اور گفتار و کردار سے فروغ حاصل ہوا۔ خاص طور پر امام علی کی جانشین کے دور میں جو لوگوں کے لئے ایک نئی صبح کے طور پر نمودار ہوئے۔ اگر یہ عمل جاری رہتا تو سنجیدہ فکر کو مہمیز کرتا اور مسلم طبقہ کی قسمت بلاشبہ مختلف ہوتی لیکن افسوس ظلم وستم کا تاریک سایہ مسلمانوں پر غالب ہونے لگا۔ اس سے بھی زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ اس ظلم کو ختم کرنے کی کوشش کو زندگی کا نئے معیار زندگی کے ستون کی حیثیت دے دی گئی۔ پالیسی کی استبدادی شکل ایک ایسی وراثت میں تبدیل ہوگئی جو ایک یادگار رہے۔ یہ تہذیب کے زوال میں معاون ثابت ہوئی۔ اس طرح کے ماحول میں لوگوں کی سیاسی تقدیر کا گلا گھونٹ دیا گیا اور صرف ایک دانشور جس نے فلسفہ، سیاسیات اور بلدیاتی مباحث کو گہری فکر سے سرفراز کیا وہ فارابی تھا۔ فارابی اسلامی فلسفہ کا بانی تھا اس سے تصور کی شروعات ہوئی اور اس کے ساتھ ہی اس کا خاتمہ بھی ہو گیا۔ اس کے بعد سیکولر مسائل کے دائرے کو فکر نے چھوڑ دیا اور ظلم وستم اور اس کے نتائج کی وجہ سے گہری تفتیش مخفی اور مابعد الطبیعاتی مظاہر پر زبردست طریقے سے واضح ہوئی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مافوق الفطرت کے بارے میں علم کے نشو ونما کے باوجود سیاسیات، سماج اور مختلف سماجی حلقوں پر فلسفیانہ افکار تقریباً پوری طرح خوابیدہ ہوگئے۔

مابعد الطبیعاتی فلسفہ کے ساتھ ساتھ ایک اور فکر مثلاً عرفان اور تصوف نے خاص طور پر سماج کے ممتاز افراد کے درمیان شہرت حاصل کی۔ اگرچہ تصوف پسندی کو ناموافق اور ناخوشگوار حالات سے شکایت اور ردعمل کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے لیکن یہ

غلط اور بیکار ردعمل ہے ۔ موجودہ سیاسی حقیقت کی تلخی کو چیلنج کرنے اور تبدیلی کی راہ کو متبادل حقیقت اور فکر کو پیش کر کے اس حقیقت کی تبدیلی کی راہ کو تلاش کرنے کے بجائے تصوف پسندی کم از کم اس کے انتہا پسندانہ تصورات نے سیاسیات اور سیاسی فکر کی مناسبت کا انکار کر کے غالب سیاسی نظام کا دفاع کیا۔ جیسا کہ فارابی نے کہا ہے کہ اس حلقہ کے بہت سے لوگوں کا ماننا ہے کہ حقیقی فہم اور نجات دنیا کی متعلقہ چیزوں بشمول مہذب معاشرہ کو مسترد کر کے ہی حاصل ہو سکتی ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انکار کر کے اور سیاست سے دور رہ کر استبدادی حکمرانوں کے خون آلود ہاتھوں میں سماج کو چھوڑ دیا۔ ناانصافی سے مدافعت کے بجائے ان لوگوں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں ۔ اگر چہ ان لوگوں نے ظالموں کا ساتھ نہیں دیا۔ اسی طرح ایک طرح کی تنگ نظری اور تعصب مسلمانوں پر غالب ہونے لگا۔ اس نے اسلامی فلسفہ جو مخفی اور مابعد الطبیعاتی تھا، اسے حاشیہ پر لا کھڑا کیا۔ سیاسی فکر کی حیثیت سے جس نے امتیاز حاصل کیا وہ ایک نظریاتی اور تجرباتی نظام تھا۔ عباسی دور کے مشہور شافعی المسلک فقیہہ اور بغداد کے مجسٹریٹ ابوالحسن الموردی کا ظہور ہوا جس نے ایک اہم کتاب الاحکام السلطانیۃ (Commandments of Kingship) لکھی تھی۔ الموردی نے حنبلی مسلک کی جو ترجمانی کی اسے بعد میں ابو عالی الفراء کی کتاب میں جس کا عنوان بھی الاحکام السلطانیۃ تھا تحریر کیا گیا۔ ان دونوں کتابوں نے پوشیدہ طور پر عباسی دور کی خودمختاری کو قانونی طور پر جائز قرار دیا اور ایک ایسے قانونی نظام کی تجویز پیش کی جس کی بنیاد مسلم سماج کی حکمرانی کیلئے اسلامی فکر پر تھی ۔ اس سماج کا اہم ستون اسلامی

مگر پوشیدہ عظمت سے روشناس کرانا چاہیئے۔

۱۰۔ دنیا کے دوسرے تمدنوں اور تہذیبوں کے مثبت پہلوؤں سے بھرپور اور پوری کشادگی سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ اور یہ ایک معنی میں جذب اور قبول کرنے کا عمل ہے اور یہ انسان کا ہی ہنر ہے جو اپنی اور اپنے ماضی کی شناخت کے ساتھ آدمی عقل اور تعقل پسندی پر زندگی کی بنیاد رکھتا ہے اور جو دوسروں نے حاصل کرلیا ہے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا ہے اور یہ عمل اندھا دھند نقالی سے بالکل مختلف ہے۔

اصول تھا۔ تاہم مذہبی قانون بذات خود فکر پر منحصر تھا۔ جس سماج میں مبنی بر عقل فکر ہوگی وہاں مذہبی قانون مرتعش معاون اور موافق ہوگا۔ عقلیت پسند فکر کے ذریعہ عدالتی مشورہ ایک ایسے قانونی نظام کی نشو ونما کر سکتا ہے جو ہم آہنگ، مناسب اور موثر ہوگا۔ لیکن مذہبی قانون جسے عقلیت پسند فکر پر مبنی ہونا چاہئے تھا اس کی شکل اور عمل کی بنیاد ہوگیا۔

نیز سیاسی فکر کی ایک ایسی مختلف شکل نے شہرت حاصل کی جو در حقیقت گذشتہ آزمودہ ماقبل اسلامی طریقہ کا احیاء تھا۔ اہم دانشوروں مثلاً ابوالحسن عامری اور مسکویہ نے ایران باستان سے آمریت پسندی کی ماقبل اسلامی روایت کی تجدید کرنے میں مدد کی۔ نظام الملک اور الغزالی کی تحریر نے مسلمانوں کی سنجیدہ فکر کی راہ میں حائل اہم رکاوٹوں میں سے ایک کی طرف توجہ کر کے اس فکر کو مستحکم کیا۔

یہ بہت ہی افسوسناک پیش رفت تھی کہ مسلمانوں نے اپنی ستم ظریفی کو خدائی تقدیر سے اور فطرت اور خدا کے ناقابل فرار عمل سے تعبیر کیا۔ اس کے بعد لوگ سیاسی حلقہ میں آمریت پسندی کے ماوراء نہیں سوچ سکے۔ لوگوں نے یا تو تقدیر کے حوالے کر دیا یا انھیں تلوار اور طاقت کے علاوہ دفاع کی کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ آمریت کی جڑوں پر روشنی ڈالنے کے بجائے تصورات کی دنیا میں تصادم سے گروہی جھگڑوں میں پھنس گئے۔ اگر ایک گروپ یہ سمجھتا کہ حکمراں طبقہ اس کے گروہی مفاد کا تحفظ کرتا ہے تو وہ اس کی حمایت کرتے اور اگر ان کا مفاد خطرے میں پڑ جاتا تو وہ حکمرانوں کے مد مقابل ہو جاتے۔ اس کی آخری مثال یہ تھی کہ عظیم المرتبت شیعہ علماء کا صفوی مطلق

العنان شیعوں کے ساتھ گہرا تعلق تھا۔ شیعہ عالموں نے صفوی حکومت کو قانونی طور پر صحیح قرار دیا تھا۔ ہمارے سیاسی فکر کی تاریخ میں مطلق العنانی کی فطرت پر سوال اٹھانے اور ان میں موجود خامیوں کو دور کرنے کی کوشش بہت کم ہوئی ہے۔

اس عام تاریخی بحث سے میں اپنی ترقی پذیری کے مسئلے پر روشنی ڈالوں گا اور ساتھ ہی دار الفنون کے ڈیڑھ سو سال بعد کی صورتحال کی وضاحت کروں گا کہ ہم آج پہلے قدم پر ہی کیوں ہیں؟ اور پھر تبدیلی اور نشو و نما کو فکر کی ضرورت ہوتی ہے اور فکر صرف آزاد فضا میں ہی پنپتی ہے۔ لیکن ہماری تاریخ نے انسانی کردار کو فروغ پانے اور سمجھنے کی اجازت نہیں دی ہے۔ اس لئے فکر و فہم اور آزادی کی انسان کی بنیادی تمنا پر دھیان نہیں دیا گیا اور اسے نظر انداز کر دیا گیا۔

پچھلے دو سو سالوں میں ہم نے ایک اضافی مسئلہ جسے خود مختاری کہتے ہیں اور ایک زیادہ خطرناک اور تخریبی کردار والی تاناشاہی کا سامنا کیا ہے۔ اس دور میں نو آبادیات کے پوشیدہ مظاہر دنیا میں پھیلے ہوئے تھے جس نے ہمیں نو آبادیات پر منحصر تاناشاہی دی۔ تاناشاہی اس وقت ایسی نہ تھی جس میں یہ محسوس ہو کہ ہمارے اوپر کوئی طاقت اور قبیلہ یا قوم غالب ہے بلکہ ایک اندرونی خود مختاری کی شکل میں آئی۔ جو ایک عالمی نو آبادیات پسند کے مفاد کو تحفظ دینے میں منحصر تھی۔ غیر ملکی نو آبادیات پسند نظام مادی اور روحانی وسائل کو لوٹ لینا چاہتے تھے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے یہ نظام تاناشاہی کو ایک فرماں بردار اسلحہ کی طرح استعمال کرتے تھے

ستم ظریفی یہ ہے کہ جو ہم لوگوں کے ساتھ ہوا اس کی وجہ سے ہمارا مزاج

آزادی کو قبول کرنے کے مطابق نہیں ہو پایا ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ پچھلے نصف صدی میں بارہا آزادی کا تجربہ کرنے کے لیے زمین مناسب رہی ہے لیکن ہم لوگوں نے ان موقعوں کو گنوادیا۔

۲۵ راگست ۱۹۴۱ء کے بعد جب متوازن آزادی کی ایک فضا ایران میں تیار ہوئی۔ تو سماجی تحریک پہلے اختلاط کا شکار ہوئی اور پھر کمزور پڑ گئی۔ موقع پرست افراد نے اس آزادی کا استعمال سماج میں رائج نظام پر اجارہ داری کرنے کے لیے کرنے لگے۔ غیر ملکی ہاتھ نے سماج میں آزادی کی فطری تحریک کو کمزور کرنے کی سازش رچنے لگے۔ اس بدنظمی کی حالت کو کچھ لوگوں کی غداری اور غیر ملکی سازش نے اور بڑھاوادیا۔ جس کی وجہ سے ایسا ماحول پیدا ہوا جن کے نتیجے میں بالآخر ۱۹۵۳ء کی سیاہ فوجی بغاوت رونما ہوئی۔ انجام کار اسلامی انقلاب نے ہمارے تحفظ کا سامان فراہم کیا اور آزادی سے روشناس کیا۔

آج اس انقلاب کے حامی اور ناقدین جو بھی سوچیں لیکن انھیں غیر جانبدارانہ طور پر یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ ایرانی انقلاب کی دو واضح خصوصیات ہیں۔ اول، ہمارے ملک کی طرح دوسرے ممالک میں جب نوآبادیات مخالف جدوجہد اکثر فوجی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ لیکن ہمارے ملک میں تاناشاہی کو، جس کا حامی سامراجی نظام تھا، بندوق کے زور پر نہیں بلکہ عوام کی شرکت، روشن خیالی اور مباحثے کی طاقت کے ذریعہ بے دخل کیا گیا۔ دوم، انقلاب کی شروعات آزادی سے ہوئی نہ کہ استبداد سے۔ چونکہ اس انقلاب میں آزادی کے عنصر اتنے وسیع تھے کہ اس کی فتح کے بعد ابتدائی دور میں

ایسا لگتا تھا کہ یہ انقلاب طوائف الملو کی کی طرف مائل ہے۔ چونکہ ہمارے سیاہ ماضی کے دوران ظلم اور تاناشاہی ہماری ثانوی فطرت روپ اختیار کر چکی تھی اس لئے ہم اس آزادی سے بھرپور فائدہ حاصل نہیں کر سکے۔ بلاشبہ غیر ملکی ہاتھ جو دو صدیوں سے ہمارے اندرونی معاملات میں ظاہری اور باطنی طور پر دخل اندازی کر رہے تھے، خاموش تماشائی نہیں رہے۔ بلکہ سازشوں اور اپنے خفیہ ایجنٹوں کے ذریعہ ہمیں فطری طور پر آزادی سے آشنا ہونے، اس کے مفاد کو سمجھنے اور اس کے چیلنجوں کا سامنا کرنے سے دور رکھا۔

ہمارے ملک کی یونیورسٹیوں میں کچھ ایسے گروہ تھے جو مسلح جدوجہد کے ذریعہ حکومت کا تختہ پلٹنے میں ہمہ تن سرگرم تھے۔ اس کی وجہ سے ایک تخریبی ماحول پیدا ہوگیا اور سبھی گروہ ایک دوسرے پر شک کرنے لگے۔ یہ فطری امر تھا کہ انقلاب کے قائدین خاموش نہیں بیٹھے تا کہ ۱۹۵۳ء کے تجربہ کا اعادہ نہ ہو۔ اس لئے ملک کو چلانے کے لیے ایسے سخت اقدام کرنے کی ضرورت پڑی جس سے مطلق العنانی کی دلدل میں پھنسنے سے ملک کو بچایا جا سکے۔ بعینہ انقلاب کے بعد جرم کی نوعیت کو کم کرنے والے حالات نے کچھ لوگوں کے لیے آزادی کو دبانے کا بہانہ فراہم کر دیا۔ ان لوگوں نے اپنی تنگ ذہنی پر مذہب کا پردہ ڈال دیا۔ جبکہ ان کا مذہب ایک ذہنی اور جذباتی عادت کے ایک سلسلہ کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ ان عادتوں پر آزادی کے ماحول میں مختلف قسم کے سوالات اٹھائے جا سکتے تھے۔ کیونکہ بہت سے لوگ ایسے تھے جو آزادی کی مطلق العنانی اور تخریب کاری کی طرف بڑھنے کے اسباب سمجھنے کے بجائے آزادی کی

مخالفت کرنے لگے۔ ان لوگوں نے چاہے اَن چاہے آزادی کو اپنے مذہبی اور قومی مفاد کا مخالف تصور کیا۔

آزادی کے نام پر امن کے ماحول کو بگاڑنا اور مذہبی اور قومی مفاد کے نام پر آزادی کو برباد کرنا ایک ہی سکّے کے دو روپ ہوتے ہیں۔ یہ دونوں روپ ہماری تاریخی علالت کو ظاہر کرتے ہیں۔ جس کی وجہ صدیوں کی مطلق العنان حکومت تھی جس نے ہمارے مزاج کو ایسا بنا دیا تھا کہ ہم آزادی کو سمجھ نہ پائیں۔ لیکن اپنی مشکلات کی چھان بین کرنے میں صرف حکومت کو ملزم قرار دینے سے قبل ہمیں خود سمجھنا ہوگا کہ آزادی اور حقوق کے ہم کتنے حقدار ہیں۔ آج ہم اپنی یونیورسیٹیوں، اسکولوں اور گھروں میں ایک دوسرے کے تئیں رواداری برتنے کے قابل نہیں ہیں۔ بلاشبہ جب تک ہم خود کو باطنی طور پر نہیں بدلیں گے اس وقت تک ہم یہ امید نہیں کر سکتے کہ باہری طاقت ہمارے مسائل حل کر دیں گی۔ ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ آزادی کا تجربہ آسانی سے حاصل نہیں ہوتا اس مسئلہ کے دو بنیادی اصول ہیں۔

سب سے پہلے ظلم کے اثرات نے ہماری دوسری فطرت کا روپ اختیار کر لیا ہے۔ انفرادی طور پر ہم سبھی لوگ کسی نہ کسی اعتبار سے مطلق العنان ہیں اور یہ بدقسمت صورتحال ہمیں اپنے معاشرہ کے ہر شعبے میں دکھائی دیتی ہے۔ دوسری طرف ایسی دنیا میں آزادی کا تجربہ کرنا چاہتے ہیں جس پر نمائشی طاقتوں کا غلبہ ہے جو صرف اپنے مفاد و مصالح کی فکر میں سرگرم رہا کرتی ہیں اور ان طاقتوں کے مفاد و مصالح کا دیگر ملکوں کی آزادی کے ساتھ ہمیشہ ٹکراؤ رہا کرتا ہے اور جو صرف اپنی سیاسی، فوجی،

اقتصادی اور اطلاعاتی طاقت کے اضافہ کی فکر میں لگی رہتی ہیں۔ اگر آزادی کے تجربے کو ہمارے ملکوں میں پریشانی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے تو اس سلسلے میں ہمیں بیرونی ممالک کی سازش کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔

یہی وہ جگہ ہے جہاں ہمیں متناقض صورتحال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک طرف آزادی کے بغیر اور فروغ کا حصول ناممکن ہے اور دوسری طرف آزادی قطعی دیرپا نہیں ہوسکتی ہے جب تک کہ سماج بالغ النظر اور ترقی پسند نہ ہو۔ ایسی صورتحال میں آخر کیا کیا جائے؟

میرا خیال ہے کہ اگر ہم لوگ فکری اعتبار سے مخلص، غیر جانبدار ہیں تو اس نتیجے پر پہونچنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی کہ آزادی کو ترقی پر اولیت حاصل ہے اور اس میں کوئی دو رائے نہیں ہے کہ آزادی کی طرف جانے والے راستے میں طرح طرح کے خطرے اور پریشانیاں ہیں یہ بات میں دوبارہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آزادی سے میری مراد فکر و خیال کی آزادی، نئی فکر کے اظہار کی آزادی اور آزاد خیال مفکرین اور دانشوروں کی حفاظت اور سلامتی کے لئے لازمی انتظامات کی فراہمی ہے۔ میرے خیال عملی طور پر یہ بات ناممکن ہے کہ کسی کی فکر کو دبایا جاسکے لیکن اگر ماحول میں آزادی فکر پائی جاتی ہے تو لوگوں کی فکر میں توازن یقینی ہے اس کے ساتھ ہی ساتھ برابری کو غلبہ حاصل ہوجاتا ہے۔ اور لوگ ترقی کی راہ پر خود بخود گامزن ہوجاتے ہیں۔ اور اگر ماحول میں آزادی کی کمی ہوتی ہے تو مفکرین اور دانشور طبقہ خفیہ اور مرموز انداز میں زندگی بسر کرنے لگتا ہے اور کبھی کبھی وہ تشدد آمیز اور دھماکہ خیز انداز میں اپنی فکر کا اظہار

کرنے لگتا ہے کیونکہ مفکرانہ اور پرامن گفتگو پر اس کو قطعی اعتماد نہیں ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ آزادی اور قومی سلامتی کے درمیان تعلقات کی تشکیل بھی ضروری ہے تا کہ قومی سلامتی پر آزادی کا مثبت اثر مرتب ہو سکے اور سماجی استحکام پر آزادی کی کمی کا کوئی اثر قائم نہ ہونے پائے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ سماج کے ممتاز افراد اور دانشور لوگ ایک طرح کی موافقت پر پہونچ جائیں کہ آج کے زمانے میں ساری قوموں کے لیے آزادی کے ایک اکلوتے پروکرسٹین ماڈل (Procrustean Model) کی تلاش بالکل بے سود ہے۔ اگرچہ آزادی کی روح ایک ہی ہوتی ہے۔ لیکن سماجی حالات اور تاریخی تجربوں کے اختلاف کی بنیاد پر مختلف قومیں اسے الگ الگ طریقوں سے مشاہدہ کر سکتی ہیں اور آزادی کی شرطوں کے پیش نظر مختلف راہیں اور ترجیحات کا انتخاب کر سکتی ہیں۔

ہم ایک مناسب ماحول پیدا کرنے کی کوشش کریں جس سے ہم ایک دوسرے کے تئیں روادار بن سکیں اور آزادی کے بارے میں ایک دوسرے کے نظریے کو بانٹیں، امیدوں اور ترجیحات کو سمجھ سکیں اور اسے قانون کی بنیاد پر رکھیں جس سے آزادی کی بقا اور تحفظ کو یقینی بنایا جا سکے۔ ایسے ماحول میں ہی ہماری نشو ونما اور ترقی کی رفتار تیز ہو سکتی ہے اور ہمارے عوام کو ایک روشن مستقبل کی ضمانت دے سکتی ہے۔

☆☆

گیارھواں باب

ہمارا انقلاب

اور

اسلام کا مستقبل

ہمارا انقلاب اور اسلام کا مستقبل

تہذیبوں کا عروج وزوال ہوتا رہتا ہے۔تاریخ کے آغاز ہی سے یہ اتار چڑھاؤ سمیری، کلدانی، اشوری، چینی، ھندی، ایرنی، رومی اور اسلامی تہذیبوں کی تقدیر کا جزولازم رہا ہے۔اسکے نقطۂ عروج ہی سے اسلام نے قدیم اور جدید تہذیبوں کے مابین رابطہ کا کام کیا ہے۔آج مغربی تہذیب کا دور ہے جس کی برتری اور تفوق دنیا کے ہر حصہ پر عیاں ہے۔

جب تک یہ لوگ ایک دوسرے سے پورے طور پر بے خبر نہیں ہیں اس وقت تک تہذیبیں ایک دوسرے کو متاثر کرتی رہتی ہیں۔امریکہ کی دیسی تہذیب پورے طور پر اس وقت تک دنیا سے اوجھل رہی جب تک یورپ والوں نے اس براعظم کی کھوج نہیں کر لیا چونکہ جب ایک بار رابطہ پیدا کیا گیا تو بڑے بڑے مدوجزر کی کھوج کرنیوالے اور تارک وطن جنہوں نے اس نئی دنیا کو فتح اور موافق حال بنایا ناکامی اور نامرادی کا سامنا نہ کر سکے۔اپنی طاقت اور وسائل کا استعمال کرتے ہوئے نوواردوں نے نہایت بے رحمی سے انہیں محکوم بنایا اور براعظم کی قدیم تہذیب کو نیست و نابود کردیا۔مغرب کے تارکین وطن نے امریکہ کو اپنی گرفت میں لے لیا۔درحقیقت شمالی امریکہ کو یورپی تہذیب کا ایک طاقتور مرکز بنانے میں کامیاب ہو گئے۔

تہذیبوں کے مابین لین دین تاریخ کا مکمل نمونہ ہے۔امریکہ کے اکتشاف سے قبل ایشیا افریقہ اور یورپ کی تہذیبوں کے درمیان عہد قدیم سے ہی باہمی رابطہ

موجود اور ایک دوسرے کے درمیان مختلف حصوں میں لین دین کا عمل جاری تھا۔ بنیادی طور پر یہ لوگ یونانی تہذیب سے متاثر تھے۔ اسلام نے یونانی افکار و خیالات اور فلسفہ سے یورپ کو متعارف کرانے میں مرکزی کردار نبھایا ہے۔ درحقیقت یہ نئی تہذیبیں کبھی بھی نئی نہیں رہی ہیں۔ چونکہ یہ ہمیشہ اگلی تہذیبوں کے نمایاں کارناموں پر خوشہ چینی کرتی ہیں۔ جو اپنی تمام موافق ضرورتوں کو جذب کرنے اور ان تمام غیر ضروری چیزوں سے احتراز کرنے کی کوشش ہے۔

تہذیبوں کے ظہور کے بنیادی وسائل

بہت سے عوامل جو تہذیبوں کے ظہور، ان کی ترقی اور تنزلی کی طرف اشارہ کرتے ہیں بنیادی طور پر دو ہیں (۱) انسانی ذہن کا متحرک ہونا (۲) انسانی زندگی میں نئی ضرورتوں کے ظہور کا لازم ملزوم ہونا۔

انسانی ذہن قدرتی طور پر متحرک ہوتا ہے وہ ہمیشہ تجسس میں سرگرداں رہتا ہے جو نئے سوالوں کے غیر محدود سلسلہ سے اس وقت تک دوچار رہتا ہے جب تک اسے جواب نہ مل جائے۔ یا یہ مطمئن ہوگا یا غیر مطمئن۔ لیکن جب کبھی کھوج کی جاتی ہے تو نئے جواباتِ ایسے نقطۂ نظر کی طرف سوالوں سے بھری ہوئی دنیا لئے ہوئے آجاتے ہیں۔

عین اسی وقت انسان اپنی مادی ضرورتوں کو پورا کرنے کی تگ و دو شروع کردیتا ہے جو انہیں ایجاد اور نئے خیالات کے ذریعہ فطرت عالم پر مہارت حاصل کرنے کیلئے اشارہ کرتا ہے۔ فطرت پر حاوی ہونے کیلئے اختیار کا اتحاد، عالم انسانی

دوسرا باب

مشرق و مغرب کے درمیان گفتگو

کی تزئین کیلئے نفسیاتی اور مادیت کی تخلیق کا اختیار یہ تمام چیزیں نئی ضرورتوں اور حاجتوں کو پیدا کرتا ہے۔ انسانی آئین کا محرک اور جوابات کیلئے نتائج کی جستجو کرنا سوالات کی طرف زور دیتا ہے۔ انسان کی دو مساوی بنیادی خصوصیات جو تبدیلی کے ناگزیر ہونے میں معاون ہوتی ہیں، تہذیبوں کے عروج و زوال کے سبب ہوتے ہیں۔ دوسری طرف انسان سماج اور فطری عوامل تنزل پذیر ہوتے ہیں یا تہذیبوں کی آمد و رفت اور لین دین میں سرعت پیدا کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں تبدیلی کیلئے ضرورت اور خواہش بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔

ہر تہذیب کی بنیاد ایک عالمی نقطۂ نظر پر مبنی ہے جو لوگوں کے مزاج اور تاریخی تجربہ کے ذریعہ خود بخود تشکیل پاتی ہے چونکہ عالمی نقطۂ نظر کا وجود کامیابی سے بنیادی سوالات اور عوامی ضروریات کی وکالت کرتا ہے۔ لہذا ہمیشہ محفوظ رہتا ہے۔ لیکن جب اجتماعی شعور اور لوگوں کی خواہش موجودہ تہذیب کی حدود سے باہر آتی ہے تو نئے افکار کی جستجو کا آغاز ہوتا ہے۔ اکثر ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ہم دوسری تہذیب کی طرف گامزن ہیں درحقیقت یہ ایک پوشیدہ ارتقاء کا اظہار ہے۔ مزید دوسری تمام تہذیبوں کے زوال کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔

تہذیبوں کا بحران

جب اسکی پہلی پیدائش ہوتی ہے تو اس کے بعد ہر تہذیب اپنی موت کے عروج پر بحرانی حالت میں بھی اپنا حامی اور طرفدار پیدا کر لیتی ہے۔ جب انسانی تاریخ میں ایک ایسے نئے معاہدہ کا ظہور ہوتا ہے اور ایک نئی تہذیب کے ظہور کیلئے زمین پوری

طرح ہموار ہوتی ہے تب سماجی عمارت کی بنیاد ڈالی جاتی ہے۔ نئی تہذیب نئی چیز کی آمد کی خبر دیتی ہے اور اکثر انقلابی رسم و رواج کی آمد کا۔ لیکن اگلی تہذیب اپنی محفوظ اور اداراتی تسلط کو ترک نہیں کر پائے گی۔ تاریخی طور پر مروج سماجی رواج کو توڑنا مشکل ہوتا ہے۔ بہت سے سماج اگلے ادوار کے خوشگوار رسم و رواج سے جذباتی اور ذہنی طور پر جڑے رہتے ہیں اسطرح کے پختہ اور گہرے رسم و رواج کو نظر انداز کرنا اور اسکی جگہ ایک نیا عالمی نقطہ نظر لانا درحقیقت ایک تکلیف دہ انفرادی بحران کو ترغیب دیتا ہے۔

عین اسی زمانہ میں نئی تہذیب حقیقی زندگی میں ہر دلعزیز نہیں رہی ہے۔ اس کے داخلی تضادات منظر نامہ سے پوشیدہ رہا کرتے ہیں کیونکہ یہ تجرباتی عمل سے دو چار نہیں ہوئے ہیں۔ نئی تہذیب کو بہت سی کوتاہیوں کو برداشت اور انہیں اپنے مطابق ڈھالنا ہوگا کیونکہ یہ سماجی زندگی کے حقائق کے اظہار میں مانع ہوتی ہے۔ جب یہ تصرف اور تبدیلی کا عمل اپنے تکمیل کی حد تک پہنچ جاتا ہے تب سماجی انفرادی بحران کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔

بحران کی دوسری مثال، ایک تہذیب کی موت اپنے عروج پر اسوقت ہوتی ہے جب تک با اثر عالمی نقطۂ نظر نفسیاتی، مادی اور مقررہ سماجی ضروریات سے مطمئن نہیں ہوسکتا۔ لوگ دقت و پریشانی کے بغیر تجرباتی عمل شروع کر دیتے ہیں۔ مزید تاریخی اعتبار سے پسندیدہ شرائط جن کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے انہیں ترک کرنا سہل نہ ہوگا۔ یہ جمود کی کیفیت صرف تہذیبی نقاب پیش کر سکتی ہے جو روح و جسم سے عاری و محروم ہوتی ہے۔ وجودیت سے محرومی ایسی چیز کی بنا ڈالتی ہے جو انفرادی بحران کی غماز

ہوتی ہے۔اس بحث ومباحثہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بنیادی سوالات اٹھائے جائیں۔
کیا تاریخی حالات وکوائف ہمارے سماج میں زندہ رہا کرتے ہیں یا کیا اسے بنانے
کیلئے ہم کوشش کررہے ہیں۔؟

مغرب میں بحران

واقعی ہمارا دور مغربی تہذیب کی محافظت اوراس کے غلبہ وتسلط کا دور ہے۔ یہ
تہذیب چارسوسالوں سے زیادہ پر محیط ہے۔اس دور میں سائنس، سیاست اور سماجی
حالات میں کافی ترقی وپیشرفت ہوئی ہے۔لیکن ہمیں یہ قبول کرنا پڑیگا کہ آج مغرب
سخت بحران سے دوچار ہے اپنے افکار وخیالات اور زندگی کے تمام شعبوں میں اس پر
بحرانی کیفیت طاری ہے۔وہ لوگ جو مغرب کی تہذیبی تاریخ، انکے فلسفہ، سائنس اور
نئے خیالات کے اظہار سے واقف ہیں وہ کم وبیش ان کے بحرانی نشانات کو دیکھ سکتے
ہیں۔مغرب اٹھارویں صدی اور انیسویں صدی کے بعض دہائیوں میں اسطرح کے
وسیع بحران سے دوچار نہ تھا۔موجودہ بحران کیا نشاندھی کرتا ہے؟

یہ خیال کرنا اب ممکن ہو چکا ہے کہ مغربی تہذیب دریدہ اور ناتواں و کمزور
ہو چکی ہے۔ایک تہذیب کیلئے چار صدی طویل زمانہ ہوتا ہے اگرچہ یہ ممکن ہے کہ
ماضی میں کچھ تہذیبیں اس سے بھی زیادہ زمانہ پر محیط رہی ہوں۔لیکن سائنس ٹیکنالوجی
اور الیکٹرانک مواصلات میں جس سرعت سے اس دور میں پیشرفت ہوئی ہے اس
سے قبل کسی تہذیب میں نہیں ہوسکی ہے۔نشاۃ ثانیہ سے لیکر موجودہ زمانے تک مغربی
طرز زندگی کو مختصراً بیان نہیں کرسکتے اور مغربی تہذیب کو قدیم خیال کرنا مبالغہ نہ ہوگا۔

مغرب : بحران سے موت تک

اس سوال کے بارے میں غور وفکر کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے کیونکہ بحران کبھی محدود اور عارضی ہوتا ہے اور یہ اکثر تہذیب وتمدن کے درمیان وقوع پذیر ہوا ہے جس کسی نے بھی مکمل طور پر بحران سے نپٹنے کیلئے اپنی طاقت اور صلاحیت کا اظہار کیا ہے وہ بحران سے محفوظ رہا ہے۔ مثال کے طور پر انیسویں صدی میں یورپ اپنے تمام بحران پر قابو پانے میں پوری طرح کامیاب ہوا تھا۔

سرمایہ دارانہ نظام جو مغربی تہذیب کے مستقبل کی کلید پیش کرتا ہے انیسویں صدی کے نصف آخر اور دوسری جنگ عظیم جو بیسویں صدی کے نصف اول میں ہوئی تھی، مغرب کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ لیکن مارکسی نظام نے بروقت اسے بچالیا مغربی ممالک اپنی ذہنی اور مساوی ساختیات کو جدید بنانے میں کامیاب ہو گئے۔

حمایت کا دعوٰی پیش کرنے کے باوجود مارکسی نظام ایک غیر عملی وغیر حقیقی فلسفہ کا حامل تھا۔ مختصراً ان تمام نقائص اور غیر موزونیت کی وجہ سے ہی یہ نظام زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہ سکا۔ یہ اپنی طاقت اور جھوٹے اشتہار کی بناء پر صرف ستر سال ہی باقی رہا۔ اب تک مارکسی نظام نے ایک مستحکم اور جامع فلسفہ کو پیش نہیں کیا ہے۔ وہ سرمایہ دارانہ نظام سے جڑی ہوئی بیماریوں کی تشخیص میں غیر معمولی مہارت رکھتا تھا۔ ایک ماہر مرضیات تھا۔ کیا مارکسی نظام نے مغرب کو اپنے دامن میں جھانکنے، سرمایہ دارانہ نظام کے اصول وضوابط نئے زمانہ کے تقاضے کے مطابق تلاش کرنے اور

اپنے سماجی، معاشی اور سیاسی نظام کی تجدید کرنے کیلیئے مجبور کیا ہے۔ مغرب کیلیئے حکمت کی کنجی یہ تھی کہ اپنے پرانے نوآبادیاتی نظام کو تبدیل کرے جو جدید نوآبادیاتی نظام کے ساتھ عالمی انتشار و دھماکے کیلیئے بیج بو رہا تھا۔

لیکن موجودہ بحران کیا ہے؟ کیا مغرب اس پریشانی کے دور سے محفوظ گذر سکتا ہے؟ ہم حتمی طور پر پیشین گوئی نہیں کر سکتے، لیکن وضاحت کیلیئے ہمیں انسانی افکار اور تحقیق آزادی دیتا ہے۔

مزید ہم حقیقی علمی ثبوت جمع کر سکتے ہیں۔ اس بنیاد پر ہم ایک اصول و نظریہ پر پہنچ سکتے ہیں۔ یہ معروضی و مدبرانہ تحقیقی ادارہ کیلیئے ایک اھم ذمہ داری ہے۔

بحران کیلیئے مغرب کا تریاق

مغرب نے ایسی حکمت عملی اختیار کی ہے جن کو وہ اس صدی کے آغاز میں ہی آزما چکا تھا اور جو گذشتہ بحران کو ناکام بنانے میں بھی معاون و مددگار ثابت ہوئی تھی۔ قدیم نوآبادیاتی نظام کے اصول اور ضابطہ میں ترمیم و اضافہ کے ذریعہ ایک پر تصنع جدید نوآبادیاتی نظام کو واضح کیا گیا۔ نام نہاد جدید عالمی نظام موجودہ بحران کو روکنے کے لئے مغرب کی نئی حکمت عملی ہے حالانکہ اسکی بنیاد ہل چکی ہے۔

امریکہ اپنے آپ کو جدید عالمی نظام کے محافظ کے طور پر پیش کرتا ہے اور وہ جدید نوآبادیاتی نظام کو نئے دور کے لیے موزوں و مناسب بنانے پر زیادہ توجہ دیتا ہے اس تبدیلی کے پیچھے جو منطق کارفرما ہے وہ ویسی ہی ہے جو قدیم نوآبادیاتی نظام سے جدید نوآبادیاتی نظام کی طرف منتقل ہوئی ہے۔ یہاں دوسرے بھی ثبوت ہیں جو

موجودہ مغربی تہذیب وتمدن کے زوال کی تصدیق کرتے ہیں۔ جب کہ یہ حقیقت ہے کہ مغربی تہذیب پرانی اور بوسیدہ ہوچکی ہے لیکن اب سوال یہ بھی ہے کہ واقعی یہ پرانی اور بوسیدہ ہوچکی ہے اس پرغور کرنے اور چھان بین کرنے کی ضرورت ہے کہ اب اس کا مستقبل کیا ہوگا؟

ہمارے انقلابی سماج میں بحران

آج ھمارا سماج ایک بحران سے دوچار ہے گرچہ یہ بحران کسی حد تک عالمی حالات کی وجہ سے ہے لیکن یہ مغرب کے بحران سے مختلف ہے۔ ہم نے اپنے انقلاب کے ذریعہ مغرب کے تسلط سے آزادی حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہمارے انقلاب نے ہمیں اپنے اندر جھانکنے پر آمادہ کیا۔ ہم نے اپنی آزادی اور اپنے روشن مستقبل کیلیئے جدو جہد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسطرح ہم نے سیاسی معاشی اور ثقافتی حلقوں میں کافی پیشرفت ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ مغرب کے مضبوط چنگل میں دوبارہ پھنس جائینگے؟ یہ اس بات پر منحصر ہے کہ ہم مستقبل میں کون سا راستہ اختیار کرتے ہیں اور مغرب کا اپنا مقدر کیا ہوتا ہے۔ ایران اور عالم اسلام کی تاریخ میں اسلامی انقلاب ایک یادگار لمحہ تھا اور ہم اپنے انقلاب کے بارے میں بجاطور پر کہہ سکتے ہیں کہ اس کی وجہ سے ہم نے مغربی اقدار سے مقروض ہوئے بغیر کامیابیاں حاصل کی ہیں جو ہمارے افکار وخیالات پر غالب وحاوی تھے۔ اپنی مستند تاریخی اور انفرادی ثقافت کو محسوس کرتے ہوئے ہم نے اپنے سماج کے نظم ونسق کے لیے ایک نئ عمارت کی بنیاد ڈالی ہے۔

ہمارے انقلاب نے ایک ایسا نظام پیش کیا جو مذہبی بنیاد پر منحصر ہے اسلئے ہمارے سماج نے اسکو جوش وخروش کے ساتھ قبول کیا۔اوراس عظیم مقصد کے حصول کے لئے لازمی اقدام بھی کیا ہے۔آج ہم لوگ جس بحران کو محسوس کررہے ہیں اس پر قابو پاسکتے ہیں بشرطیکہ باہری شناخت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ایک نیا نظام اور نیا طریقہ اپنائیں۔ ہمارا موجودہ بحران ہی ایک نئے بحران کو جنم دیتا ہے جیسا کہ میں نے پہلے بھی ذکر کیا ہے۔ ہماری نئی تہذیب اب ظہور کے قریب ہے۔

ہم اس بحران کا مقابلہ گھبراہٹ سے نہیں کرسکتے۔ہمیں اس بحران کو ہمت اور عقلمندی سے قبول کرنا ہے ہمیں اس نئے دور کے آغاز کا بنیادی تاریخی سوال معلوم ہے اب ہم اس کو حل کرنے کے لئے آرزو وخواہش کرسکتے ہیں۔

ہم اپنی زندگی اسلام کے ارکان کے مطابق گذارنا چاہتے ہیں اور ہم اسلامی تہذیب کو بنانے کی خواہش بھی رکھتے ہیں۔ایسے وقت میں جب مغربی تہذیب اپنے آخری دور سے گذررہی ہے تو ہمیں یہ سوال پوچھنا چاہئے کہ کیا اسلامی تہذیب کا ایک بار ظہور ہوا تھا اور صدیوں پہلے ختم بھی ہوگیا؟ ایک تہذیب کے خاتمہ کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ہم اسکے بنیادی افکار واعمال اور نصیحتوں پر زیادہ دنوں تک نہیں چل سکتے۔کیا یہ قانون ہماری تاریخ پر نافذ نہیں ہوتا ہے؟ کیا اسلامی تہذیب کے آنے اور جانے کا یہ مطلب ہے کہ اسلام کا وہ عہد اب باقی نہیں رہا جس نے اسلامی تہذیب کے لئے بنیاد فراہم کیا تھا؟

اگر اس سوال کا یہ مثبت جواب ہے تو کیا ہمارا انقلاب لاحاصل نہیں رہا

کیونکہ ہر وہ روایت اور قانون جو تہذیبوں کی نشو ونما میں معاون اور مددگار ہے اس کے ہم مخالف ہیں؟ یہ ایک اہم سوال ہے جو ہمارے انقلاب کو جھنجھوڑتا ہے۔ اگر ہم عقل اور معروضی انداز سے رسائی حاصل نہیں کرتے ہیں مزید اس اہم مسئلہ کا مضبوط حل تلاش نہیں کرتے ہیں تو ہمارے انقلاب کو بڑے خطرے کا سامنا کرنا پڑیگا۔

میرے مذکورہ سوالوں کا جواب اگر منفی ہے تو میں اس جواب سے اس ضابطہ کو نظر انداز نہیں کرنا چاہتا جو میں نے تہذیبوں کیلئے تجویز کیا ہے۔ میں اپنے مذہبی نقطۂ نظر کی بنیاد پر یقین رکھتا ہوں کہ قانون مضبوط ہوتے ہیں۔

اگر بہت سی یادگاری نعمتوں، کامیابیوں اور برکتوں کے باوجود اسلامی تہذیب پر آفتاب غروب ہو چکا ہے اور مذہب کا ایک مخصوص رنگ وروپ جو اس دور کے لئے موزوں اور مناسب تھا، ختم ہو چکا ہے تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ خود مذہب کا دور ختم ہو چکا ہے۔

اس میں ایک سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ مذہبوں کے مابین معرکہ آرائی شروع ہو گئی اس میں ایک خاص مذہب کے افکار و خیالات ایک مخصوص عہد میں بلا شک وتردید پروان چڑھتے رہے۔ فطری طور پر وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ اس خاص مذہب کے افکار و خیالات اور اسکے اثرات محدود و متروک ہوتے گئے۔ در حقیقت یہ مذہب کے ایک عہد کا خاتمہ ہوا ہے۔ لیکن مذہب اس تہذیب وتمدن سے برتر واعلی ہے جسے یہ پیدا کرتا ہے۔

تہذیب مخصوص ضروریات اور لوگوں کے شکوک وشبہات کو ایک مخصوص وقت

اور مخصوص مقام میں پیش کرتا ہے۔ جب حالات اور وقت بدل جاتے ہیں تبھی نئے سوالات جنم لیتے ہیں جو ایک نیا حل چاہتے ہیں۔ اسطرح سے ایک نئی تہذیب کی ضرورت پیش آتی ہے۔

دوسری طرف مذہب ایسے دائمی سوالات پر روشنی ڈالتا ہے جو انسانیت کے لئے عام اور لامنتہی راستہ ہموار کرتا ہے۔ ناسازگار اور نامناسب حالات کے باوجود بھی زندگی کے لئے ایک رخ طے کرتا ہے۔ مذہب انسان کی صلاحیتوں کو بلندیوں تک لے جاتا ہے۔ اور لوگوں کو مختلف تاریخی ادوار میں بھی انکی فکری ذمہ داری سے باخبر رکھتا ہے۔

اسطرح اگر ہم سوچیں کہ مذہب تہذیب و تمدن کے مساوی ہے تب اسکا مطلب واضح اور روشن ہو جاتا ہے کہ تہذیب کے زوال کے ساتھ ہی مذہب کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ لیکن اگر ہم یہ مان لیں کہ مذہب تہذیب اور جماعت کے خاص اصولوں سے بالاتر ہے تب ہمیں مختلف معنی بتلاتا ہے جو مختلف تہذیبوں کی نشو ونما میں معاون و مددگار ہوتا ہے۔ انسانی زندگی میں جو ضروری تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں اس سے مذہب پر چنداں اثرات مرتب نہیں ہوتے ہیں۔

اگر ہم اس نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں تو ہم پاتے ہیں کہ مذہب کی بنیاد اثر آفریں ہے۔ اور یہ کسی دور میں بھی سوالوں کا جواب اور ضروریات کی تکمیل کر سکتا ہے۔ حالانکہ پرانی اسلامی تہذیب ختم ہو چکی ہے۔ جب مذہب کی جڑیں کافی مضبوط ہوتی ہیں تو ایک نئی تہذیب جنم لیتی ہے۔ اس عام تعارف کے ساتھ میں ان اہم مسئلوں کو پیش کرنا چاہوں گا جو آج ہمارے سماج کو درپیش ہے۔

مذہبی حکومت کے نظام کو ٹھوس بنانے کا ہمارا خوش آئند خواب سماج کے مستقبل
کے لئے خلا میں حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ عالمی برادری کو ساتھ لئے بغیر ہم اپنے
خیالات کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتے۔ ہم نے ایسے وقت اس اہم کام کو کیا ہے جب دنیا پر
مغربی تہذیب کا تسلط ہے۔ ہم لوگوں کو یہ کوشش جاری رکھنا ہے تا کہ ہم مغربی تہذیب
کے تسلط سے آزاد ہو سکیں۔ یہ فطری امر ہے کہ ہم مغرب سے مقابلہ کریں، اس مقابلہ
کا نتیجہ ہمارا مستقبل طے کریگا۔

مغرب کے دو چہرے

مغرب دو چہروں کو پیش کرتا ہے۔ ایک سیاسی اور دوسرا دانشورانہ۔ اسکے سیاسی
رخ سے مغربی تہذیب کا باہری روپ نظر آتا ہے۔ مغربی تہذیب کی عالمانہ اور
دانشورانہ بنیاد عالمی نقطۂ نظر کی وضاحت کرتی ہے۔ ہمیں ان دونوں کے مابین امتیاز
پیدا کرنا ہوگا۔

مغرب نے سیاسی، معاشی، فوجی دفاعی اور تکنیکی طاقت کے حصول کو اپنا محور و
مرکز بنایا ہے اسکے لئے اس نے پروپیگنڈہ کے طور پر مواصلاتی سازو سامان کا سہارا
لیا تا کہ دنیا کے معاشی نظام پر اس کا تسلط و غلبہ ہو سکے۔ نیز اس نے اس بات کی بھی
کوشش کی کہ دنیا کے تمام معاشی نظام پر مغرب کا کنٹرول ہو۔

مغرب کے ترقی یافتہ نظام اور اداروں نے اپنی سیاسی طاقت کا جواز پیش
کر کے دنیا کی معاشی ترقی میں اپنے حصے کو یقینی بنانے کیلئے کوششیں تیز کر دیں۔ مغربی
سرمایہ دارانہ نظام میں فوج کی بڑی اہمیت ہے اور فوجی معاہدہ بہ نسبت ہمارے یہاں

مشرق و مغرب کے درمیان گفتگو ☆

کسی بھی علمی اجتماع و اجلاس میں شرکت کرنا میرے لئے ہمیشہ ہی باعث مسرت رہا ہے۔ اس طرح کی مجالس میں کارروائی بالعموم تین نقطوں کے اردگرد گھومتی ہے۔ بولنا، سننا اور سمجھنا۔ بولنے اور سننے کے عمل سے نتائج کو سمجھنا اور گفتگو و سماعت کے ساتھ اگر مشاہدہ کو بھی ملا دیا جائے تو وہ انسان کی اہم ترین طبیعی، نفسیاتی اور روحانی سرگرمی شمار ہوگی۔ مشاہدہ ہمارے علم کی سرحدوں کو وسعت بخشتا ہے اور انسان کی خودی کے ادراک کو مضبوط کرتا ہے۔ یہ احساس کہ میرا وجود ہے لیکن جب ہم دوسروں سے مکالمہ میں مشغول ہوتے ہیں، مشاہدہ اس کے گھر کی اساس سے شروع ہوتا ہے۔ اساس جس پر لیبل ''میں'' کا لگا ہوتا ہے۔ دنیا اور انسان کا تعلق عالم بصارت سے ہے اور ''وہ جو میں دیکھتا ہوں'' کے ذیل میں آتے ہیں۔ لیکن دیکھنے اور سننے کا عمل دو فریقی اور کبھی کبھی بہت سے فریقوں کے درمیان ہوتا ہے۔ ایک وہ

☆ جناب محمد خاتمی صدر اسلامی جمہوریہ ایران و صدر اسلامی کانفرنس تنظیم کے خطبہ کا متن جو انہوں نے یوروپین یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ، فلورینس میں ۱۰ر مارچ ۱۹۹۹ء کو دیا۔

کے وہاں زیادہ عام ہے اس لئے اس نے یہ دعویٰ پیش کیا کہ مغرب کو فوجی قوت کے استعمال کا حق اب بھی باقی ہے۔

جہاں تک سیاسی عدل وانصاف کا تعلق ہے تو مغرب کسی بھی ملک کو آزاد، خود مختار نہیں دیکھنا چاہتا اور وہ یہ بھی نہیں چاہتا کہ دنیا کا کوئی بھی ملک اپنی تقدیر کا مالک خود ہو، بلکہ وہ ان تمام معاملات میں دخل اندازی چاہتا ہے۔ اور یہ صرف اسلئے کہ معاشی لحاظ سے کوئی ملک آگے نہ بڑھ سکے اور جہاں تک ممکن ہو اس کا غلط اور ناجائز استعمال کیا جاسکے۔ سب سے اہم نقطہ یہ ہے کہ مغرب چاہتا ہے کہ دنیا کے افکار وخیالات پر اسی کا تسلط اور غلبہ ہو اور دوسروں کو ہرے ہرے باغ دکھا کر محکوم وغلام بنایا جائے۔ ایسے موقع پر ہمیں معلوم ہے کہ دشمن اپنے تمام سازوسامان کے ذریعہ قائل کرنے کی کوشش کرتا رہے گا۔ مگر اس وقت ہمارا اولین فریضہ یہ ہونا چاہئے کہ ان کے تمام ناپاک ارادوں کو ناکام کردیں۔

سیاسی طور پر دشمن اپنے تمام سائنسی وتہذیبی حربوں کا استعمال کرے گا مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ تمام تگ ودو اپنے مفاد کی خاطر کرے گا تا کہ اس کے سرمایہ دارانہ نظام کو غلبہ اور تسلط حاصل ہو سکے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مغرب اپنی عیارانہ اور اشتعال انگیز تکنیک اور تدابیر کے ذریعہ عوام کے ذہن کو حقیقت کی طرف سے پھیرنے کی کوشش کریگا۔

جب سامراجی طاقتیں دوسروں کے حقوق کو سلب کرتی ہیں تو اس کا راز یہ نہیں ہوتا کہ مظلوم کو لوٹا جائے یا ان کے سیاسی وسائل کو کمزور کیا جائے بلکہ ان کا مقصد یہ ہوتا

ہے کہ وہ پوری انسانی برادری کو باخبر کرسکیں کہ ان کا یہ عمل پوری انسانیت کیلئے قابل ستائش ہے۔ زمانہ قدیم میں استعماری طاقتوں نے تہذیب وتمدن کے نام پر انسانیت کا قتل عام کیا تھا اور آج بھی جمہوریت، انسانی حقوق اور آزادی کے نام پر انسانیت کا گلا گھونٹ رہی ہیں۔

ایسی حالت میں ہماری کوشش کا محور و مرکز پہلے اپنے آپ کو خود کفیل بنانا اور صلح ومصالحت کے طریقہ پر آگے بڑھنا ہے تب ہی جا کر ایک دن ہم ضرور ان قوتوں کا مقابلہ کرسکیں گے اور یہ چیزیں ہمارے بس سے باہر کی نہیں۔ بلکہ ہمیں خدا پر توکل کرنا ہوگا۔ اس سے ہدایت طلب کرنی ہوگی نیز اپنی تاریخ پر بھروسہ کرنا ہوگا۔ ایک دن ایسا آئے گا کہ ہم اپنی کھوئی ہوئی شئے کو اپنے انقلاب کے ذریعہ دوبارہ حاصل کرلیں گے۔

ہمیں اپنی قوم پر یقین کامل ہے۔ قوم کے سہارے ہی اپنی آزادی کی خواہش کو مستحکم اور مضبوط کرسکتے ہیں ہمیں مربوط انداز میں دشمن کی مخالفت کرنی پڑیگی جنکے یہاں انسانی اقدار کی کمی ہے۔ ایسی تمام قومیں جو آزادی کی متوالی ہیں انہیں دشمن کے منافقانہ رویہ ظلم وزیادتی اور جرائم سے سبق حاصل کرنا پڑیگا۔

ہم یہ نہیں سمجھتے کہ مغرب اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کیلئے اپنی تہذیب کا سہارا لینا بند کردیگا۔ مغربی تہذیب صرف سیاست تک محدود نہیں بلکہ ان کی جڑیں مضبوط ہیں، یہ سوچنے سمجھنے کا ایک نظام ہے، اسلئے ہمیں اس پر سنجیدگی سے غور کرنا ہے اور اس سلسلے میں سوچنا ہے۔ ہم ان کا مقابلہ اپنے فلسفہ اور اخلاق سے کرینگے اور ہمارا

یہ عمل ایک سیاسی حریف کے طور پر نہیں ہوگا بلکہ مصلح و مدبر کی حیثیت سے ہوگا۔ مغرب کا مقابلہ حکمت و عقل سے ہوگا نفرت و عداوت اور جذباتی نعروں سے نہیں اور ہمارا یہ عمل خواہ ذاتی شکست ہو یا موثر اقدام۔

طاقت کا استعمال فوجی معرکہ آرائی، سازش یا سیاسی سبوتاژ کے لئے تو مناسب ہے لیکن نظریاتی اور تمدنی معاملات میں فوجی، حفاظتی اور عدالتی ذرائع کا استعمال مخالفین کے ردعمل کو مزید ہوا دے گا۔ ہمیں اپنے مخالفین کے اعتراضات کا جواب عقلیت اور روشن خیالی پر مبنی زیادہ ٹھوس اور طاقتور جوابی دلائل سے دینا ہوگا۔ ہم صرف جامع اور پر کشش فکر کے ذریعہ ہی اس قسم کے خطرات کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اگر ہم میں اس طرح کے منطق اور علم کا فقدان ہے تو ہماری اولین ترجیح یہ ہونی چاہئیے کہ ہم اسے حاصل کریں۔ اسلام ہمیں اس طرح کی صلاحیت فراہم کرتا ہے اور اگر چند مسلمان اس سے ناآشنا ہیں تو یہ انکی کمی ہے نہ کہ اسلام کی۔

اگر کچھ لوگ خدانخواستہ اپنے کٹر خیالات کو اسلام پر مسلط کرنا چاہتے ہیں اور اسے مذہب خداوندی کا نام دیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان میں اپنے مخالفین کے اعتراضات کا جواب دینے کی صلاحیت نہیں ہے اسی وجہ سے وہ شدت پسندی پر کمربستہ ہوگئے ہیں۔ تشدد سے انکا مقصد تو پورا نہیں ہورہا ہے البتہ اسلام کو نقصان ضرور پہنچ رہا ہے۔

ہم مغرب کی مخالفت اس نیت سے کرتے ہیں کہ ہم اس کے سیاسی، ذہنی، معاشی تسلط سے آزاد ہوسکیں۔ کیونکہ بحیثیت مسلمان ہمارے خیالات اور

ہمارے اقدار ان سے مختلف ہیں۔ لہٰذا ہمارے پاس اپنے اختلافات کے نکتوں اور مخالفین کے تسلط کو سمجھنے کے لئے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں کہ ہم مغرب کا باریک بینی اور معروضی نقطۂ نظر سے مطالعہ کریں اور اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔

اس ضمن میں ہمیں اس امر کو بھی ذہن میں رکھنا ہوگا کہ مغربی تہذیب کی بنیاد تصور آزادی پر قائم ہے۔ اور یہ ایسی قدر ہے جسے تاریخ کے ہر دور میں مستحسن قرار دیا گیا ہے۔ ہمیں یہ اعتراف تو کرنا ہی پڑے گا کہ مغرب دور وسطیٰ سے دور جدید میں داخل ہوتے ہوئے اپنے افکار، اپنی سیاست اور معاشرتی زندگی کے متعدد توہمات کی بندش سے آزاد ہوگیا ہے، اس نے انسان کو مختلف استحصالی روایتوں (Traditions) سے بھی نجات دلایا ہے۔ مغرب نے ان رجعت پرست افکار کو بھی مسترد کردیا ہے جسے مذہب کے نام کا سہارا لے کر عوام پر مسلط کر دیا گیا تھا۔ اس نے استبدادی حکومت کی غلامی کی زنجیروں کو بھی توڑ دیا ہے۔ یہ ایسے مثبت اقدام تھے جو تخلیقی اپج کو فروغ دیتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود انسانی آزادی کے تئیں اس کا نقطۂ نظر منجمد اور ایک طرف ہے جس کی بھاری قیمت آج تک انسانیت کو چکانی پڑ رہی ہے۔

مذہب کے دفاع کے لئے اگر ہم مغرب سے نبرد آزما ہو رہے ہیں، اسکی مخالفت کر رہے ہیں اور اس سلسلے میں عوام کی آزادی پر پابندی عائد کر رہے ہیں تو یہ ایک بڑی تباہی کا موجب بن سکتا ہے، نہ تو تخلیقی اپج کی روایت اسکی متحمل ہو سکتی ہے اور نہ ہی اسلام اس کی اجازت دیتا ہے۔ لیکن اگر ہم انسانی آزادی کے مغربی تصور کو

ہدف تنقید بنا کر اسے مسترد کر رہے ہیں تو ہم اپنے سب سے بنیادی مشن کی تکمیل کرلیں گے۔

بے شک ہم کو آزادی کے مغربی تصور سے اختلاف ہے، ہمارے خیال میں نہ تو آزادی کا مغربی تصور مکمل ہے اور نہ ہی انسانی خوشحالی کا ضامن۔ مغرب اپنی تاریخی فضا اور فکر میں اس قدر ڈوبا ہوا ہے کہ انسانی آزادی کے غلط تصور کی وجہ سے جو بحران پیدا ہو رہا ہے اسکو وہ نہیں دیکھ سکتا۔ اگر ہم باہر سے مغرب کا مطالعہ کریں تو اس نکتہ کو بہ آسانی معروضی انداز میں سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن اس مقصد کے لئے دانشورانہ کاوش اور علمی لیاقت کی ضرورت ہوگی۔

مغرب کے فائدہ مند تجربات

جیسا کہ دھیرے دھیرے مغربی تمدن از کار رفتہ اور کمزور ہو رہا ہے۔ انسانیت آج اپنے مستقبل کے لئے ایک نئی بصیرت کی متلاشی ہے اور ایک ایسے تمدن کی انتظار میں ہے جو اسکی مادی اور روحانی ضروریات کو پورا کر سکے۔ اپنے اسلامی انقلاب کے ذریعہ ہم نے ایک نئے نظام کی تشکیل کی کوشش کی ہے، جو مغربی دنیا میں رائج اقدار اور بصیرت سے بالکل مختلف ہے۔ کیا ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہمارے اسلامی انقلاب سے انسانی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے؟

جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے، کوئی بھی تمدن اپنے پیش رو تمدن کے اثرات سے آزاد نہیں رہ سکتی۔ انسانی ذہن اپنی فطرت کے اعتبار سے ایسا ہوتا ہے کہ ماضی کے تجربات اور علوم سے اسکا رشتہ اچانک اور مکمل طور پر منقطع نہیں ہوتا۔ انسانی ارتقاء کا

راز اس حقیقت میں مضمر ہے کی ایک نسل نے جہاں اپنی کامیابی کو چھوڑا دوسری نسل نے وہیں سے شروع کیا۔ اگر تمام نسلیں ایک ہی مقام سے شروع کرتیں اور دوسرے مقام پر ختم ہو جاتیں تو انسان بھی مکھیوں کی طرح زندگی گزارنے پر مجبور ہوتا۔ انسان اور دوسری مخلوقات میں یہی فرق ہے کہ انسان اپنے ماضی کے تجربات سے فائدہ اٹھاتا ہے اسے نکھارتا ہے اور اپنی کامیابیوں کو آئندہ نسل کے لئے چھوڑ جاتا ہے۔ یہ عمل انسانی نسل کے روئے زمین پر ورود سے آج تک جاری ہے۔ لہٰذا انسانی ارتقاء کی کوئی حد فاصل مقرر نہیں کی جاسکتی۔

تہذیب جو انسان کی دانشورانہ جذباتی اور عملی کاوشوں کا ثمرہ ہے اسی طرح کام کرتی ہے۔ ایک نئی تہذیب کی تشکیل کے لئے ایک لچک دار فکروہ ہے جو اپنی پیشرو تہذیب کے مثبت پہلوؤں کو اپنا کر اس میں مزید اضافہ کرلے۔

ہم اپنے عوامی انقلاب کے ذریعہ ایک اسلامی نظام کی تشکیل کے خواہاں ہیں لیکن ہم اپنے انقلاب کے ذریعہ ایک جدید تہذیب کی تشکیل کے بارے میں اسی وقت سوچ سکتے ہیں جب ہم میں مغربی تہذیب کے مثبت اور منفی پہلوؤں کی پرکھ کا مادہ موجود ہوتا کہ انہیں اپنی ضرورت کے مطابق قبول اور مسترد کر سکیں۔ اگر اس ردو قبول کے صبر آزما مراحل سے کامیابی کے ساتھ گزر گئے تو ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔

اگر ہمیں مغرب کی مثبت اقدار کو قبول کرتے ہوئے اسکی منفی اقدار کو رد کرنا ہے تو اس کے علاوہ اور کوئی تدبیر نہیں ہے کہ سب سے پہلے مغربی تہذیب کو حقیقی اور مجموعی

طور پر سمجھا جائے۔ اس کی خوبیوں کو قبول کرنے اور خامیوں سے دور رہنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ دیانتداری اور معروضی طور پر اس کا مطالعہ کرتے ہوئے اسلامی انقلاب پر ہی اعتقاد رکھیں۔ ظاہر ہے کہ یہ نقطۂ نظر مغرب کے تئیں اس بے لچک سیاسی جائزے سے مختلف ہے جو سیاسی اور غیر سیاسی مغرب کے امتیاز کے فہم سے قاصر ہے۔ انجانے میں ہی سہی اس سے قوم اور اسلامی انقلاب دونوں کے مفاد کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ یہاں صرف خود احتسابی اور عقلیت پر مبنی معروضی نقطۂ نظر ہی مؤثر ثابت ہوسکتا ہے نہ کہ نفرت انگیز مکالمات اور تشدد۔

ہمارے انقلاب کی مشکلات

درحقیقت ہمارے اسلامی انقلاب کی وجہ سے دنیا کے مختلف علاقوں میں غیر معمولی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ اس انقلاب کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے سب سے زیادہ ہم ہی متاثر ہوئے ہیں۔ یہ انقلاب ایک عظیم اور دشوار مشن ہے جو ہم سے مزید بصیرت اور دوراندیشی کے ساتھ ساتھ صبر و تحمل کا بھی مطالبہ کرتا ہے۔

گو کہ اسلام اپنے ماننے والوں کے اجتماعی شعور، افکار اور اقدار کے ساتھ صدیوں سے ثابت قدم ہے، لیکن ہمارے انقلاب نے اسے ہم عصر سیاسی اور سماجی فضا سے ہم آہنگ کیا۔ اس دوران ان نئی تبدیلیوں کی وجہ سے تین نئے challenges ہمارے سامنے آئے ہیں۔ پہلا، ہمارے عوام کی توقعات، دوسرا مخالفین کی دھوکہ دھڑی اور سازشیں اور تیسرا معاشرتی تنازعات۔

سب سے پہلے ہم عوام کی توقعات کا جائزہ لیں گے۔ اب جب کہ نئے افکار و

خیالات پر مبنی نئے نظام نے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی ہے تو لوگوں کی امید بھی بڑھ گئیں ہیں اور وہ لوگ اس میں اور زیادہ حق بجانب ہیں جنہوں نے اس نظام کے حصول کے لئے قربانیاں دی ہیں۔ انقلاب سے قبل عوام کے توقعات زیادہ نہیں تھیں کیونکہ ہماری معیشت، تہذیب، سیاست اور تعلیمی نظام پر ہمارے دشمنوں کا غلبہ تھا۔ اور ہمیں یہ باور کرایا جاتا تھا کہ ہم اپنی قسمت کے فیصلے خود نہیں کر سکتے۔ لیکن اب ایک اسلامی اور آزاد حکومت اقتدار میں آ گئی ہے، ملک کے تمام وسائل اس حکومت کے ہاتھوں میں آ گئے ہیں تو عوام کا یہ حق ہے کہ وہ اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کا مطالبہ کریں۔

عوام یہ خواہش ظاہر کرتے ہیں نئے نظام میں انکی زندگی کو کیسے منظم کیا جائے اور انکے حقوق کی حفاظت کی ضمانت کون دیگا۔ وہ یہ بھی جاننا چاہتے ہیں کہ سائنس اور تکنیک، سماجی انصاف اور عدل کے تئیں اس نظام کی پالیسیاں کیا ہوں گی؟

کچھ توقعات بلاشبہ غیر حقیقی ہیں۔ کوئی بھی حکومت راتوں رات کوئی معجزہ کر کے تمام مسائل کا حل نہیں تلاش کر سکتی اور نہ ہی یہ مطالبات اپنے وسائل کے حقیقی تجزیئے پر مبنی ہیں۔ ظاہر ہے کہ غیر حقیقی بصیرت کے ساتھ ساتھ غیر عملی افکار نے اس قسم کے غیر مناسب توقعات کو فروغ دیا ہے پھر بھی حکومت میں صلاحیت ہونی چاہیئے کہ وہ عوام کی ضرورتوں کو پورا کرے اور انکے نظریات اور توقعات کو تبدیل کرنے کیلئے راہ ہموار کرے۔ گرچہ تمام توقعات کو پورا کرنا ممکن نہیں ہے، اور حقیقت بھی یہی ہے تو کم از کم لوگوں کو یہ باور کرایا جائے کہ ہمارا مقصد اس طرح کی زندگی کو فروغ دینا ہے

جس میں اسکی مادی اور روحانی ضرورتوں کو پورا کیا جاسکے۔

ہمارے معاشرے کو یہ یقین ہونا چاہیئے کہ انقلاب نے اسے جو دیا ہے اور اس سے جو امید رکھتا ہے اس کے اپنے تمام انسانی وسائل اور اس کی نعمتوں اور کامیابیوں کو بروئے کار لاکر افراد اور سماج دونوں کی ضرورتوں کو پورا کیا جاسکتا ہے۔ ہمارے معاشرے کو یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ ہمارا نظام اپنے مخالفین کی توہین کیلئے بھی نہیں ہے۔ عوام کی حقیقی توقعات نے سرکاری حکام اور اعلیٰ طبقے کو اپنے کام کی انجام دہی کے لئے غیر معمولی دباؤ ڈال رکھا ہے اور ہمارے دشمن ان توقعات کو مزید بڑھانے کی مسلسل کوشش کررہے ہیں۔

دوم، مخالفین کا فریب اور سازش۔ ہمارے کامیاب انقلاب سے قبل ہمارے مخالف مکتبہ فکر سے نظریاتی طور پر متعدد اختلافات تھے۔ اس وقت وہ معرکے آسانی سے انجام پاتے تھے کیوں کوئی حقیقی مزاحمت نہیں تھی۔

انقلابی نظام کو ختم کرنے کی سازش جاسوسی، معاشی دباؤ، ہمارے عوام کے بیچ ناامیدی اور قنوطیت کا پھیلاؤ، ہماری مشکلات کو سرکاری نظام سے منسوب کردینا اور یہ دعوٰی کرنا کہ یہ نظام عوامی مشکلات کا حل نکالنے میں ناکام رہا ہے۔ اور اس حد تک کوشش کرنا کہ فوجی طاقتیں انقلاب بلکہ اس کی بنیاد کو ہی اکھاڑ پھینکیں۔ ساری سرگرمیاں مخالف طاقتوں کی ہمیشہ سے رہی ہیں جس میں انکا مفاد چھپا ہے کیوں کہ انہیں اس نئے نظام سے خوف لاحق ہے۔ آج کے دور میں ہمارے عظیم ملک کو ہر طرح کی سازشوں کا سامنا ہے۔ کبھی کبھی یہ حالات ان خطرات کا سامنا کرنے کے لئے جو

غیرملکی دشمنوں کے پیدا کردہ ہیں یا ان غیرملکی افراد کی جوان کے تئیں بہی خواہ ہیں،
ہمیں اس بات پر مجبور کرتے ہیں کہ ہم اپنے معمولی ذرائع پر ہی مرکوز رہیں۔

سیکولر دانشور

ہمارا معاشرہ ایک مذہبی شناخت رکھتا ہے۔ شیعیت کی تاریخ کے پورے دور میں علماء نے عوام کو سماجی خرابیوں کے خلاف جگانے، ظلم کے خلاف لڑائی پر ابھارنے اور انکی مذہبی شناخت کے تئیں انہیں بیدار رکھنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ہماری تاریخ میں اسلام نے ہمیشہ لوگوں کو مذہبی عقائد میں سماجی انصاف کی طرف اپنی مسلسل دعوتوں کی وجہ سے عوامی مذہبی رہنماؤں نے سماج کے ایک بہترین نبض شناس معالج کی حیثیت سے اپنی خدمت انجام دی ہے۔

اس وجہ سے مسلم معاشرے کے اندر مذہب کا منفی نظریہ کبھی پنپ نہیں سکا۔ مغربی معاشرہ اسکے بالکل برعکس ہے وہاں بدمذاق اور غلط تربیت یافتہ مذہبی لیڈروں نے لوگوں کو مذہب ہی سے برگشتہ کر دیا ہے۔

اسلامی دنیا کے اندر بالخصوص ایران میں جب بھی مظلوم لوگوں نے کسی ظلم و بربریت کے خلاف آواز اٹھائی ہے ان کی یہ سرگرمیاں مذہب ہی کے راستے سے ظاہر ہوئی ہیں۔ جن افراد نے ظلم و تشدد کے خلاف لڑائی لڑی ہے انھوں نے مذہبی انقلابات کے خونیں اور شدت آمیز چہرے کا مشاہدہ کیا ہے۔

ہمارے معاشرے کا ذہن ان پر تشدد حادثات کی یادوں سے ابھی تازہ ہے جو سچے معتقدین کی ان نام نہاد لوگوں اور منافقین کے ساتھ ہوئے جنھوں نے مذہب کا

کوشش جو حق کی تلاش میں کی جائے اور ایک باہمی فکر و فہم کی کوشش۔ پس ''گفتگو'' کا تعلق نہ تو اہل تشکیک سے ہے اور نہ ہی اس گروہ سے ہے جو ''حق'' پر مالکانہ حقوق کا دعویٰ کرتے ہیں۔ یہ اپنے خوبصورت مگر نقاب سے ڈھکے ہوئے چہرہ کی جھلک ان مسافروں اور راہرؤوں کو دکھاتی ہے جو ہاتھ میں ہاتھ ڈالے دوسرے لوگوں کے ساتھ انکتشاف کرنے کی نیت سے آگے بڑھتے جاتے ہیں۔

یہ جملہ ''تمدنوں اور تہذیبوں کے درمیان گفتگو'' جس کو دوسرے تمدنوں اور تہذیبوں سے مکالمہ کے طور پر سمجھنا چاہیئے یہ دراصل حق اور سچ کی تعریف پر مبنی ہے اور یہ تعریف ضروری طور پر ''حق'' کی دوسری معروف تعریفوں کے مقابلے میں جو فلسفے کے متون میں ملتی ہیں، اس سے نرالی یا انوکھی نہیں ہے۔ ''تمدنوں کے درمیان گفتگو'' اس بات کی مقتضی ہے کہ دوسرے تمدنوں اور تہذیبوں کو سنا جائے اور دوسروں کو سننے کی اہمیت ان سے گفتگو کرنے سے کم نہیں ہے۔ بلکہ یہ اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔

بات چیت اور سننا ہی مکالمہ اور گفتگو کا سبب بنتا ہے۔ ایک فریق دوسرے کو مخاطب کرتا ہے اور مکالمہ کا تبادلہ ہوتا ہے۔ انسان کو کن حالات میں مخاطب کیا جاتا ہے، دوسرے لفظوں میں جس موقع پر خطاب کیا جاتا ہے اس وقت مخاطب کس عالم میں ہے۔ سائنس کی دنیا میں خطاب یا مکالمہ نہیں ہے۔ سائنس ایک شعوری کوشش اشیاء کے تعلق کو کشف کرنے کی اور اس وجہ سے سائنسی گفتگو انسان کے شعور کی سطح سے سبقت نہیں لیجا سکتی۔ لیکن اس کے برعکس ہنر اور مذہب کی دنیا گفتگو اور مکالمے کی دنیا ہے۔ ہنر اور فن کا کوئی بھی شاہکار انسان کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے اس سے مخاطب

استعمال لوگوں کی مصیبتوں اور پریشانیوں کو جائز ٹھہرانے کے لئے کیا۔ ہمارے خطے کی دنیا نے اس دشمنی ااور بغض وعناد کا قریب سے مشاہدہ کیا ہے جو سچ اور انصاف پسند مذہب اور ظلم واستبداد پر مبنی غیر صحیح نظریہ مذہب کے درمیان پایا جاتا ہے۔ اور جس نظریہ دین کو ظالم وتشدد پسند لوگوں نے آلہ کار کے طور پر استعمال کیا ہے۔

کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ اسلامی تاریخ کے اندر مذہب نے مذہبی اور سیکولر استبدادی نظام کی مخالفت کی ہے؟ کیا سچائی کی خاطر شہید ہونیوالوں کی اکثریت مذہبی نمائندوں کی نہیں ہے؟ اور کیا یہ امر واقعہ نہیں ہے کہ گذشتہ ایک صدی سے مذہب استعماریت کے ظالم ایجنٹوں کے خلاف لڑائی کا زبردست حامی رہا ہے؟ کیا مذہبی جدوجہد کا تجربہ دوسرے انقلابی اور قومی تجربات کے درمیان جس میں سے کچھ واقعی لائق تحسین ہیں سب سے زیادہ کامیاب نہیں ہے؟

ہمارا معاشرہ ایک مذہبی معاشرہ ہے اور یہ فطری بات ہے کہ سیکولر دانشوروں کو کبھی بھی سماجی استحکام حاصل نہ ہوا یا لوگوں کے دلوں میں انہیں کوئی جگہ نہ مل سکی۔

بدقسمتی سے جسے سارے سماج میں تعقل پسندی یا دانشوریت کا نام دیا جاتا ہے وہ ایک تحریک ہے جو ایک سطحی چیز ہے۔ اور جس کا عوام سے براہ راست کوئی تعلق نہیں اور ان نام نہاد دانشوروں کی آواز کبھی بھی ان چائے اور قہوہ خانوں کی چار دیواری سے باہر نہیں نکلی جہاں سے وہ سیاسی مخالفت کا مظاہرہ کرر ہے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر ان لوگوں نے بھی انکی یہ آواز سنی تو وہ ان لوگوں کیلئے ناقابل فہم تھی اس طرح سے ان لوگوں کے درمیان آپس میں کوئی اتفاق رائے یا باہمی سمجھوتہ کی شکل نہیں پیدا ہوسکی۔

اگر عوامی رجحان رکھنے والی دانشوریت منظر عام پر آئی اور اسے مقبولیت اور احترام ملا تو یہ ان لوگوں کے ہاتھوں ظاہر ہوئی جو قابل اعتبار تقلیدی اور مذہبی تعلیمات پر اعتماد کا دعویٰ کرتے ہیں اور بعض شخصیات کی مقبولیت اور ہردلعزیزی کا یہی راز ہے مثلاً جلال آل احمد اور علی شریعتی۔ یہ دونوں شخصیتیں حقیقی معنوں میں دانشور تھیں۔ اور ہمارے سماج نے یہ محسوس کیا کہ یہ شخصیتیں لوگوں کا جزو لاینفک تھیں جنہوں نے عوام کے درد والم اور پریشانی کے بارے میں اظہار خیال کیا۔

سیکولر دانشور دانستہ یا غیر دانستہ طور پر اسی دشمن کی ہمنوائی کرتے ہیں جو ہماری آزادی کے مخالف ہیں۔ اور ہماری صحیح وسالم ثقافت، مذہب اور آزادی کی مخالفت کرتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ مذکورہ جماعت مجموعی طور پر اسی کے راستہ پر گامزن ہے جس نے وقتاً فوقتاً عملی طور پر غیر ملکیوں کے ظلم و جبر کو مسلط کرنے میں تعاون کیا ہے۔ لیکن خوش قسمتی سے اسکی جڑیں ہماری ثقافت میں گہری نہ ہونے اور عوام کے دلوں میں گھر نہ کرنے کی وجہ سے اسکا کوئی اثر مرتب نہیں ہوا۔ آج بھی میں یقین رکھتا ہوں کہ سیکولر دانشوروں سے کوئی حقیقی خطرہ نہیں ہے۔ حالانکہ اس بات کا احتمال ہے کہ وہ لوگ نوجوانوں میں اور معاشرہ کے حساس طبقوں میں بے چینی پیدا کریں یا دشمن کو محفوظ مقام و پلیٹ فارم فراہم کریں جو ہمارے معاشرے میں سرایت کر جائے۔

مذہبی عقیدہ

دوسرا اہم مسئلہ جسکا ہمیں سامنا ہے۔ وہ مذہبی عقیدہ رکھنے والوں کی محدود

مذہبی سوچ اور ماضی پرستی کے تصورات کا ہے۔ مذہبی یقین صرف نامکمل انسانی تعبیرات کو ناقابل تنسیخ اور ابدیت بخشتا ہے اور حسب حال اور حقیقت پسندانہ غور وفکر پر جذبات اور احساسات کو ترجیح دینا ہے۔

اگر ہم مخصوص عقیدہ رکھنے والوں سے دریافت کرتے ہیں جو اپنے کو مفکرین اور دانشوروں میں شمار کرتے ہیں کہ وہ انقلاب سے کیا توقع رکھتے ہیں تو وہ دعوی کرتے ہیں کہ وہ اسلامی تہذیب وثقافت کی واپسی چاہتے ہیں۔

ہم ایسے افراد کو پورے اعتماد کے ساتھ آگاہ کرتے ہیں کہ ان کی خواہشات حقائق وتعبیرات پر مبنی ہیں۔ وہ مخصوص تصورات جن سے اسلامی تہذیب مستحکم ہوئی اور اس عہد کے تہذیب کے گذرنے کے ساتھ ختم ہوگئی اگر وہ متحرک زمانہ، حالات کے مطابق تبدیلی اور لوگوں کے مسائل کے حل کیلئے افادیت اور اہمیت کو برقرار رکھتے تو وہ تہذیب زندہ اور پائندہ رہتی۔

عقیدہ ایسے نظام کی تشکیل میں رکاوٹ اور مشکلات پیدا کرتا ہے جو انسانی زندگی کے حال و مستقبل کو بہتر بنانے کیلئے ایک نمونہ پیش کرتا ہے۔ ایک ایسا نظام جو خاص مسلک اور عقیدہ کے مقابلہ میں ایک مضبوط منطقی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔ ہمارا معاشرہ جو ایک خاص مذہبی شناخت رکھتا ہے۔ اس پر عقیدہ کا اثر بڑا گہرا ہوتا ہے۔ اسکا منفی اثر سیکولرزم سے زیادہ ہے کیونکہ خاص طور پر عقیدہ کو ماننے والے عموماً مذہبی جواز کیلئے ایک خاص ماحول اور نمایاں چیزوں کو مشتہر کرتے ہیں۔ ان کے مذہبی فرائض

انہیں مجبور کرتے ہیں کہ وہ کچھ کریں لیکن درحقیقت اسلام کے صحیح پیغام سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا اور نہ ہی اسلامی انقلاب حال و مستقبل کیلئے مفید ہوتا ہے۔

امام خمینی اپنی زندگی کے آخری دو سال میں خاص طور پر انقلاب کے راستوں کیلئے اور اسلامی معاشرہ کی اصلاح وترقی کیلئے ماضی کے ایک خاص عقیدہ سے وابستہ رہے اور اسکے خطرات کے سلسلہ میں کافی متفکر تھے۔ اس سلسلہ میں امام خمینی کی ہدایات اور رونما ہونے والے واقعات پر بیدار نظر رکھنے کی تاکید مستقبل میں اسلامی انقلاب کے متعلق بہت اہم اور بنیادی ہیں۔

مذہبی تعقل پسندی کا فقدان

ایسے حساس مقام پر میں یہاں اپنے معاشرہ کی اہم اور نمایاں خامیوں میں سے ایک پر نظر ڈالنا چاہتا ہوں۔ اس امید کے ساتھ کہ مفکرین کو غور وفکر کی دعوت ملے، چاہے وہ میرے نقطۂ نظر سے موافقت کرتے ہوں یا مخالفت، یا اس میں ترمیم و اضافہ کے خواہش مند ہوں۔

میری نظر میں جو سب سے اہم نقص ہے وہ ہمارا فکری میدان ہے اور اس میدان میں ترقی کا فقدان ہے، یا مذہبی تعقل پسندی کی کمزوری ہے۔ میں اس کے ظہور اور ترقی کے لئے پوری طرح زمین ہموار پا رہا ہوں۔

ہماری نظر میں ایک دانشور وہ ہے جو اپنے عہد میں سانس لیتا ہے اور اس عہد کے تقاضے اور مسائل سے باخبر ہوتا ہے جن سے اس دور کی انسانیت دوچار ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ اس سے متعلق علم کیلئے کوشاں رہتا ہے کیونکہ وہ اس زمانے کے مسائل کو اچھی

طرح جانتا ہے اور مسائل کے حل کیلئے مرجع خلائق کی امید اسی کی ذات ہوتی ہے۔ بھلا ہم ایسے آدمی سے مسائل کے حل کی امید کرسکتے ہیں جو یہ نہیں جانتا ہو کہ معاشرہ کو کوئی مسئلہ درپیش ہے۔ اس مقام پر اخلاقی پاکیزگی اور نہ ہی علم اپنے آپ میں کافی ہوگا۔ ایک مہذب و باادب شخص جو اپنے آپ میں متحرک دائرۃ المعارف ہے لیکن وہ اپنے عہد و زمانہ سے کنارہ کش رہتا ہے اور عہد کے مسائل کو حل کرنے کیلئے مثال و نمونہ دوسری اور تیسری اسلامی صدی میں ڈھونڈتا ہے جس سے اس عہد کا معمولی سا مسئلہ بھی حل نہیں ہوسکتا۔ اور آج کے مسائل ان کیلئے فائدہ کی چیز نہیں ہیں۔

مذہبی کون ہے

وہ شخص مذہبی ہے جسکے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت محدود اور مادی نظریہ سے متصادم ہوتی ہے۔ اس وقت وہ انسانیت کو فطری وجود سمجھتا ہے لیکن وہ اسے فطری دنیا تک ہی محدود نہیں رکھتا بلکہ وہ انسانیت کو دنیا پر ترجیح دیتا ہے۔ کیونکہ دنیا محدود ہے جب کہ انسانیت لامحدود اور ابدی ہے۔ انسانی ضرورتیں بھی لامحدود ہیں۔ نہ اسکے لئے کوئی جگہ ہے اور نہ ہی اسکا کوئی وقت متعین ہے۔ یہی اصل وجہ ہے کہ انسان ماضی و مستقبل پر غور کرتا ہے اور اپنی ذہنی صلاحیتوں کے ذریعہ تمام فطری قیود سے تجاوز کرجاتا ہے۔

مذہبی مفکر وہ ہے جو انسانیت سے محبت کرتا ہے۔ اسکے مسائل کو سمجھتا ہے اور انسانیت کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتا ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ انسانیت ایک امر مسلمہ ہے جو آزادی کی خواہاں ہے۔ کیا وہ مشکلات میں انسانیت کی ترقی اور نشو و نما

میں آزادی کے خلاف ہے؟

ہمارے سماج میں مذہبی مفکرین کی ہمیشہ ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔اگر مذہب اور تعقل پسندی دونوں ایک دوسرے سے مربوط ہیں تو ہم یہ امید کر سکتے ہیں کہ ہمارا اسلامی انقلاب انسانی تاریخ میں ایک نئے عہد کا آغاز تھا۔لیکن اگر یہ دونوں ایک دوسرے کے متضاد اور علیحدہ ہیں تو ان میں سے دونوں ہمارے سماج کی صحت و فلاح کیلئے نقصان دہ ہیں۔

جب آپ ایک سیکولر مفکر کے سامنے خدا کا تذکرہ کرتے ہیں تو وہ انسانیت کو اپنی زندگی کا اولین مقصد بتاتے ہیں۔اسکے برعکس اگر آپ کسی مذہبی مفکر کے پاس انسانیت کا تذکرہ کرتے ہیں تو ان کا جواب ہوتا ہے کہ خدا کی خوشنودی ان کا اولین مقصد ہے۔وہ انسانیت کو خدا کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق تلاش کرتے ہیں۔

میں امید کرتا ہوں کہ ہمارا انقلاب ان دونوں کے درمیان رابطہ کا ایک بہترین ذریعہ ثابت ہوگا۔ہم دینی اداروں اور اہم اسلامی مراکز کو دنیا (یونیورسٹیوں) سے جوڑ کر مذہبی افکار کے داعی ہیں۔اور اس طرح ہماری یہ سوچ نہ تو سیکولرزم کے خلاف ہے اور نہ ہی مذہب کے۔یہی وہ عوامل ومحرکات ہیں جنھوں نے ہمارے انقلاب کو کامیاب وکامراں بنانے اور سماج کو ایک بڑے بحران سے نکال کر ترقی کی راہ پر گامزن کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے اور یہ تمام چیزیں انسانیت کی خدمت میں نیز ایک روشن مستقبل کی تعمیر وترقی میں بھی معاون ومددگار رہیں۔

مختصر سوانح حیات

سید محمد خاتمی ۲۳ مئی ۱۹۹۷ء کو دو تہائی ووٹوں کی اکثریت کے ساتھ اسلامی جمہوریہ ایران کے صدر منتخب ہوئے۔ وہ ۱۹۴۲ء میں سنٹرل ایران کے ایزد کے قصبہ اردکان کے متوسط طبقہ کے ایک مذہبی خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید آیت اللہ روح اللہ خاتمی اپنے تقویٰ وطہارت اور ترقی پسند خیالات کی وجہ سے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

۱۹ سال کی عمر میں خاتمی مذہبی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے اردکان چھوڑ کر قم چلے گئے جہاں وہ ۱۹۶۵ تک مقیم رہے۔ پھر اصفہان یونیورسٹی میں فلاسفی پڑھنے کے لئے داخل ہوئے اور اسی کے ساتھ وہ اسلامی سیاست میں بھی سرگرم ہو گئے۔ ۱۹۶۹ء میں انہوں نے تہران یونیورسٹی میں بی۔اے میں داخلہ لیا۔ دو سال بعد پھر وہ قم واپس آئے جہاں انہوں نے اسلامی قانون، فقہ اور فلسفہ کے میدانوں میں مزید دینی تعلیم حاصل کی، اور قم میں قیام کے دوران انکی سیاسی سرگرمیوں میں مزید اضافہ بھی ہوا۔ ۱۹۷۸ء میں ایرانی انقلاب کے موقع پر جرمنی میں ھمبرگ اسلامک انسٹی ٹیوٹ کی سربراہی کے لئے ان کا انتخاب ہوا۔ اس ادارہ نے ایران سے باہر رہنے والے ایرانی باشندوں کی انقلابی سرگرمیوں کی تنظیم وتنسیق میں نمایاں رول ادا کیا۔ ۱۹۸۲ سے ۱۹۹۲ تک انہوں نے وزیر برائے ثقافت اور اسلامی گائڈنس کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دیں۔

۱۹۹۲ء میں انھیں صدر جمہوریہ اور ایران کی نیشنل لائبریری کے سربراہ کا

معاون مقرر کیا گیا اور اپنے صدر منتخب ہونے تک وہ اس عہدے پر برقرار رہے۔
صدر خاتمی عربی، انگریزی اور جرمنی زبانوں سے واقفیت رکھتے ہیں۔ انکی کئی
کتابیں اور متعدد مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں: ''بیم موج''
(Fear of the wave) ۱۹۹۳ میں اور ''از دنیای شاہ تا شہر دنیا'' (From
the city-World to the World-city) ۱۹۹۴ میں۔ انہیں فارابی،
ملا صدرا، شیخ انصاری اور حافظ کے کاموں سے کافی دلچسپی ہے۔ وہ شادی شدہ ہیں اور
انکے تین بچے ہیں۔

☆☆☆☆☆

جی۔ٹی۔سی۔

Khatami. Mohammad.

Islam, dialogue and civil society.

1. Islam and politics. 2. Civil society-Islamic countries.
4. Religion and Civilization. 4. International cooperation.
5. Islamic countries-Civilization. I. Centre for Persian and Central Asian Studies; School of Language, Literature and Culture Studies, Jawaharlal Nehru University. II. Title

---

Published by: The Registrar, Jawaharlal Nehru University,
New Delh-110067 ; INDIA

ایک عوامی اعتماد کے
حامل سیاسی رہنما اور ایک مشہور
علمی و ادبی شخصیت کی حیثیت سے
صدر جمہوریہ سید محمد خاتمی ہمیشہ اعلیٰ انسانی قدروں کی
مقبولیت کیلئے کوشاں رہے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ
تہذیبوں کے درمیان سودمند گفتگو کے ذریعہ ہی عالمی سطح
پر مستحکم اور حقیقی صلح وسلامتی کا قیام عمل میں آسکتا ہے اور
عصر حاضر میں دنیای بشریت اسی صلح کی تلاش میں
سرگرداں ہے۔

ہوتا ہے اور مذہب میں خدا کا کلام انسان سے خطاب کرتا ہے۔ اسی وجہ سے عرفان اور
مذہب کی زبان آپس میں حقیقی اور گہرائی کے ساتھ مربوط ہے۔ اور اسی وجہ سے ابتدائی
دور کے ہنری شاہکار تخلیق تو انسان کی ہیں لیکن وہ مقدس ہنروفن کا نمونہ ہیں۔
بائبل اور قرآن مقدس میں بار بار انسان کو مخاطب کیا گیا ہے اور اسی تخاطب کی
وجہ سے ایک شخص کا انفرادی انسانی وجود مقام بالا حاصل کر لیتا ہے۔

اگر صنعت اشتقاق کے طور پر دیکھیں تو شخص کا لفظ Persona سے متعلق
ہے۔ جس سے مراد وہ مکھوٹا ہے جس کو ایکٹر حضرات تھیٹر میں اپنے چہرہ پر لگاتے ہیں۔
اہم نکتہ یہاں پر یہ ہے کہ مذہبی تخاطب کا تصور جب انسان سے خدا خطاب کر رہا ہے
آفاقی اور تمام سطح پر، مذہبی تعلیمات اور کردار و عمل کے محدود دائرہ میں نہیں۔ ایسی
حالت میں اسکی نفسیاتی، سماجی یا کسی تاریخی پہلو سے بھی خطاب نہیں ہے۔ انسان کی
حقیقی، غیر تاریخی اور انفرادی طبیعت کو خطاب کیا گیا ہے اور اسی وجہ سے تمام آسمانی
مذاہب اپنے جوہر کے اعتبار سے مختلف نہیں ہیں۔ اختلاف صرف مذہبی قوانین اور
کردار و عمل کے دائرہ میں ہی ہے۔ یہ انسانی زندگی کو قانونی اور سماجی اعتبار سے ہی
اپنے کنڑول میں رکھتا ہے؟۔

ہمیں اپنے آپ سے یہ سوال کرنا چاہیئے کہ وہ 'شخص' جس سے خطاب کیا جا رہا
ہے وہ کون ہے۔؟

ابتدائی دور کے فلسفیوں نے اپنے اوقات اور اپنی قوت و توانائی کا بیشتر حصہ
اس سوال کا جواب معلوم کرنے میں ہی خرچ کیا ہے۔ انہوں نے اسی وضاحت میں

کہ کیسے اور کس طریقہ سے انسان کو پہچانا جائے اور پورے معنی میں اس کے 'اندرونی حصہ' کو دیکھا جائے۔ کیسے کوئی شخص اپنی شناخت آپ کر سکتا ہے اور خود بینی کی منزل تک پہنچ سکتا ہے۔ فلسفیوں کی جستجو اور تلاش کا بیشتر حصہ اسی پر صرف ہوا ہے۔

فلسفہ کے اعتبار سے تشریح ایک دلچسپ داستان ہے۔ اس میں وہ وقایع بھی شامل ہیں جنکا تعلق خود شناسی اور خود کشفی کے بیان سے ہے۔ فلسفہ کی الف لیلہ میں کئی طول طویل راتیں فلسفہ کی تاریخ کے بیان میں گزر جائیں گی۔ اس میں سے کچھ پہلی دفعہ مشرق میں بیان کی گئیں اور کچھ مغرب میں۔ یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ مشرق کی کہانیاں انسان کے مشرقی پہلو کو بیان کرتی ہیں جبکہ مغرب کی کہانیوں میں مغربی خاصیت سامنے آتی ہے۔ درحقیقت انسان میں مشرق کی روح اور مغرب کی تعقل پسندی جمع ہوگئی ہے۔ کسی ایک جوہر کا انکار ہماری فکر و فہم کو انسان کے بارے میں متاثر کر دیگا۔ 'شخص' کو پورے طور پر سمجھنے کے سلسلہ میں ہماری کوشش 'انفرادیت' یا 'اجتماعیت' کے جال میں نہ پھنس جائے۔ اگرچہ عیسائی مفکرین کے نظریات نے بھی موجودہ 'فرد' کے تصور کو واضح کرنے میں مدد کی ہے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ان دونوں میں ایک فطری تعلق ہے۔ جیسے شخص یا ذات پر خصوصی توجہ کی گئی اور اسکو کلام الٰہی کو حاصل کرنے والی ذات کی 'حیثیت سے پہچانا گیا ہے۔ میری نظر میں یہ انفرادیت پسندی کا اثر تھا۔ یقیناً آج کے سماج میں ایک شخص واحد ہی تمام اداروں کے لئے معیار و میزان ہے۔ قوانین ہوں یا سماجی تعلقات، شہری حقوق ہوں یا انسانی حقوق ان سب کا تعلق اسی فرد واحد سے ہے۔ دوسری طرف 'اجتماعیت' جو

انفرادیت کے مقابلہ میں وجود میں لائی گئی تھی اور جس میں دراصل انفرادیت کے تصور کو بڑھا کر پیش کیا گیا تھا اسی وجہ سے اان دونوں تصورات کی فلسفیانہ بنیاد ایک ہی ہے۔ اس وجہ سے ہم اپنی روحانی عقلیت پسندی کی بدولت 'انفرادی آزادی' اور 'اجتماعی اشتراکیت' کے اختلاف کو سطحی اور اا تفاقی تصور کرتے ہیں۔ شخص یا ذات کے تصور کو اسلامی عرفان کے نقطۂ نظر سے بخوبی بیان کیا جا سکتا ہے۔ مسلمان عارف 'انسان' کو ایک جہان تصور کرتا ہے ۔'کائنات' اصغر انسان کے وجود کا دارومدار نہ تو اسکی انفرادیت پر ہے اور نہ ہی اسکی اجتماعیت پر۔ اسکی اصل اس پر مبنی ہے کہ وہ ہے اور وہ وہی تنہا ہے جسکو آسمانی ندا دی گئی ہے۔ اس خطاب کی بدولت انسان کی روح اپنی سرحدوں کو بھی پار کر گئی اور اس روح کی آمد سے اسی دنیا دنیائے انصاف وانسانیت بنتی ہے۔

علم فلسفہ کے پیچیدہ اسباق کا اجمالی تجزیہ کرنے والا کوئی بھی شخص ابتدائی مرحلہ سے لیکر آج تک یہی دیکھے گا کہ فلسفی حضرات کا جھکاؤ ایک انتہا سے دوسری انتہا کی جانب رہا ہے۔ آخری جھونٹا یا اس زنجیر کی آخری کڑی جدت پسندی ہے۔ یہ لفظ شاید جدید ترین اصطلاح جسکا استخراج لاتینی لفظModernus(جدید) سے ہوا اور ظاہراً انیسویں صدی میں پہلی دفعہ استعمال کی گئی لیکن یہ لاتینی لفظ پندرھویں صدی سے مستعمل ہے۔ البتہ انیسویں اور بیسویں صدی میں جدت پسندی یا جدیدیت کا استعمال وسیع تر تصور کے ساتھ مختلف میدانوں میں ہوا۔ جیسے فلسفہ، فنون لطیفہ، سائنس، تاریخ اور اخلاقیات۔ ان تمام تصورات کا مشترک نسب وہ طغیان ہے جس

نے انسانی وجود اور فکر کو قرون وسطی کے آخر میں ہلا کر رکھ دیا تھا۔ یہ ایک ایسا طوفان تھا جس نے انسان اور دنیا کو ایک نئے دائرہ میں داخل کر دیا۔ انسان اور موجودہ دنیا (جہاں تک یہ انسانوں کے خیالات سے متاثر ہوتی ہے) اس نئے دائرہ میں متوسط دور کے بعد داخل کی گئی۔ اس نئے دائرہ پر اس زمانہ میں جدید کا لیبل لگا دیا گیا لیکن آج اس کو ہم نشاۃ ثانیہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اٹلی نے نشاۃ ثانیہ کی پیدائش میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اگرچہ بہت سی کتابیں اور مضامین اس عظیم سنگ میل کو بیان کرنے اور اسکی وضاحت میں لکھے گئے ہیں۔ لیکن آج بھی فلسفیوں، مورخوں اور سائنسدانوں کو اس پر غور و فکر کرنا چاہئے اور اس پر بات کرنا اب بھی واجب ہے۔

نشاۃ ثانیہ کا صرف یہ مقصد نہیں تھا کہ وہ یونان کی کلاسیکی ثقافت اور اس کے کلچر کو دوبارہ زندہ کر دے۔ اس کا اصلی مقصد تھا -- جیسا کہ بہت سے مفکرین نے اس طرف اشارہ کیا ہے -- مذہب کا احیاء کیا جائے اور اسکو نئی زبان اور جدید خیالات دیئے جائیں۔ نشاۃ ثانیہ نے مذہبی آدمی کی تعریف اس طرح کی کہ وہ حقارت سے دنیا کی طرف پیٹھ نہیں پھیرے گا اور نہ ہی اسکو ترک کریگا بلکہ دنیا میں رونما ہونے والے حالات و حوادث کا مقابلہ کریگا۔ نشاۃ ثانیہ کا یہ مذہبی آدمی دنیا کی طرف ایسے بڑھتا ہے جیسے دنیا اپنے بازو کھولے اسکا استقبال کر رہی ہو۔ یہ دو طرفہ استقبال اور انسان اور دنیا کا ایک دوسرے کے لئے کھلنا ہی نشاۃ ثانیہ کا بنیادی نقطہ ہے۔ اور باطنی طور پر یہ ایک مذہبی واقعہ تھا جس کا مقصد مذہب کی حفاظت، اصلاح اور تبلیغ تھا اس کی تردید یا مخالفت ہرگز نہیں۔

اس عظیم واقعہ کا اختتام ایک خاص مدت میں اصل نیت اور خواہش کے برعکس ہوا۔ دنیا ابتدائی مرحلہ میں ہی پرتشدد فتوحات اور تسخیرات میں بدل گئی۔ یہ پرتشدد فتوحات صرف فطرت کو ہی مسخر کرنے تک محدود نہ رہی بلکہ اس آگ نے جلد ہی انسانی اقوام کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یورپ کی سماجی وسیاسی تاریخ میں جس کو نوآبادیاتی نظام کہا جاتا ہے دراصل وہ انسان کا جذبہ حکمرانی اور تسخیر ہے جس کے نتیجہ میں وہ فطرت، طبیعی علوم انسان اور انسانیت پر قبضہ جماتا ہے۔ اور نتیجہ کے طور پر ظاہر ہے کہ ہم اس باب کو جو جدت پسندی کے بارے میں ہے، بغیر انسانی اور اخلاقی نقطۂ نظر اپنائے پڑھ نہیں سکتے ہیں۔ جدت پسندی کا مبصر اور محقق جو ایک مفید نقطۂ نظر کا حامل ہے، وہ یقیناً دوسرے مشہور ناقدین سے بالکل مختلف ہوگا۔ خاص طور سے فلسفہ کے میدان میں کوئی آدمی درخت کو سنوارنے اور اسکی آرایش میں حواس کی ٹہنی یا تنے کو نہیں کاٹے گا جس پر وہ خود کھڑا ہوا ہے۔ ہمارے عہد کے بعض فلسفی جدت پسندی پر تبصرہ کرتے ہوئے بعینہ یہی کررہے ہیں۔ تعقل پسندی کو جب کوئی منطقی اختیار نہ دیا جائے بلکہ وہ اس کو ایک ایسے ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں جو ہر چیز اور ہر شخص کو تباہ وبرباد کر ڈالے اور یا اس کو ایک ایسی کند اور زنگ آلود تلوار میں بدلنا چاہتے ہیں جس کی جگہ کی عجائب گھر یا میوزیم میں ہو۔ کوئی بھی تعقل پسندی کو ایک تنقیدی ہتھیار کے طور پر استعمال نہیں کرسکتا جب تک بغیر اسکی محدودیت اور پابندی کو تسلیم کرتے ہوئے اسکو بااختیار نہ بنایا جائے۔

خالص تعقل پسندی کے مبصر جنکی بدولت مغربی فلسفہ میں ایک نئے باب کا

اضافہ ہوا ہے، وہ ہر چیز اور جملہ تصورات بشمول خالص تعقل پسندی کو اپنی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ وہ اس صورت میں ممکن ہے جب تعقل پسندی کو اختیار بخشا جائے۔ تعقل پسندی کو اختیار دیئے بغیر -- جس پر میں مناسب موقع پر تفصیل اور عمدگی کے ساتھ بحث کرونگا -- اس کے تعلق کو بالادستی اور طاقت سے فراموش کیئے بغیر -- آزادی، انصاف، امن اور انسانی حقوق جیسے اہم سیاسی مسائل کا صحیح اور واضح تصور ممکن ہی نہیں ہے اور بغیر واضح تصور کے ان خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلہ میں ہماری کوشش رائگاں چلی جائے گی۔ لیکن اس کو تعقل پسندی اور یوروپین طرز کی واحد مرکزیت کہا جاتا ہے جو جدیدیت کے دور سے ذرا قبل موجود تھی۔ درحقیقت یوروپ ہی نے جدید تعقل پسندی کو جنم دیا ہے تو ان کی ذمہ داری بھی سوا ہو جاتی ہے کہ وہ اس پر تنقید و تبصرہ بھی کریں اور اس کے تباہ کن نتائج سے بچانے کے لئے حل بھی تلاش کریں۔

یوروپ کا ضرورت سے زیادہ تعقل پسندی پر انحصار آج وہاں کے مفکرین اور فلسفی تعقل پسندی کا بھرم ہی ختم کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ مشرق جس نے صرفی اعتبار سے بہت سے ایسے الفاظ جن میں نظم اور ضبط کا تعین ہے، دیئے ہیں جو مغرب سے تاریخی تناظر میں گفتگو کر سکتے ہیں تاکہ باہمی طور پر افہام و تفہیم ہو سکے۔ یوروپ اور امریکا کو دعوت دی جائے کہ وہ زیادہ برابری، سنجیدگی اور غور و فکر والا رویہ اپنائے تاکہ دنیا میں امن، تحفظ اور عدل و انصاف قائم کرنے میں انکا حصہ ہو۔ اگر اس کو مشرق کی اصطلاح میں استعمال کیا جائے تو وہ مغربی کلچر کے دونوں ڈایونیسین اور اپولونین عناصر

سے بھی آگے بڑھ جائیں گے۔ روشن فکری کے زمانہ کو اپولونین عہد کہا جاتا ہے جبکہ
رومانی تحریک کا پنڈولم مخالف سمت میں گیا ہوا تھا۔ اگلی صدی روحانیت کی جانب ہونی
چاہئے جس کو مشرق کا انسان کئی ہزار سال سے برت رہا ہے۔

یوروپین کلچر کی حیات اور کثرت کو قوت اسکے تنقیدی نقطۂ نظر سے ملتی ہے۔
جب وہ سب چیزوں بلکہ خود پر بھی اس طرح نظر ڈالتا ہے۔ لیکن اب وقت آگیا ہے
کہ یوروپ ایک قدم آگے بڑھائے اور دوسروں کی طرح وہ اسکو دوسرے نقطۂ نظر
سے دیکھے۔ اسکا قطعاً یہ مطلب نہیں ہے کہ یوروپ اپنے قدیم ورثہ سے نظریں پھیر
لے یا وہ ایک دوسری تاریکی کی سمت بڑھ جائے بلکہ یہ یوروپین کلچر اور تمدن کو چاہئے
کہ وہ نئے تجربات کے ذریعہ عالمی ثقافتی جغرافیہ کے بارے میں صحیح معلومات حاصل
کرے۔ مشرق شناسی میں مشرق کو مطالعہ کا ایک اہم موضوع تو قرار دیا گیا ہے لیکن
گفتگو میں شامل دوسرے فریق کی حیثیت کا حامل نہیں ہے۔ ''تمدنوں کے درمیان
گفتگو'' صحیح معنوں میں اسی وقت ممکن ہے جب مشرق اس مذاکرہ میں ایک موضوع
مطالعہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک سرگرم عمل رکن کی حیثیت سے شریک ہوتا کہ
تمدنوں کے درمیان گفتگو جیسے اہم منصوبے کو عملی جامہ پہنایا جا سکے۔ یوروپ اور امریکا
کے لئے یہ قدم اٹھانا انتہائی ضروری ہے۔ یقیناً یہ یک طرفہ دعوت نہیں ہے۔ ایک
ایرانی، ایک مسلمان اور ایک ایشیائی ہونے کی حیثیت سے مغرب کے بارے میں صحیح
علم حاصل کرنے کے لئے ہم لوگوں کو بھی اہم قدم اٹھانے پڑیں گے۔ اور یہ علم ہی
ہماری اقتصادی اور سماجی زندگی کے معیار کو اونچا کریگا۔ ہمارے اور اہل یورپ کے

اس شجاعانہ اقدام کیلئے ایک عملی نمونہ وکرداری خاکہ کی ضرورت ہوگی اور یورپ میں سب سے پہلے اٹلی کے لوگوں نے گفتگو کی اہمیت کو پہچانا اور اس کو غیر معمولی بڑھاوا بھی دیا۔

نشاۃ ثانیہ کے مورخین نے لکھا ہے کہ اٹلی والوں کا بائیزینٹیم اور اسلامی دنیا کے ساتھ لگاتار تعلقات کیوجہ سے اٹلی والوں میں قوت برداشت آگئی۔ ایٹالیائی لوگ صلیبی جنگوں کے زمانہ سے اسلامی تمدن سے واقف تھے اور وہ اس کو پسند کرتے تھے۔ ایک غیر ملکی تہذیب کا علم اور اس سے واقفیت اور احساس تعجب ہی اٹلی والوں میں قوت برداشت کو بڑھانے میں سب سے بڑا عامل ثابت ہوا۔ اور یہ بھی ایک عجیب وغریب مذاق ہے کہ قوت برداشت کا تصور جو اہل یوروپ نے مسلمانوں سے اخذ کیا تھا اور جو ان سے ربط وضبط کے نتیجہ میں اپنایا تھا، وہ آج کے دور میں اہل یوروپ مسلمانوں کو اخلاقی اور سیاسی نصیحت کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔ اہل یوروپ پر تحمل و برداشت کے اس احساس پر مسلمانوں کے اثرات کی نمایاں شہادت موجود ہے اور یوروپ کی ادبی تاریخ سے اسکا پتہ چلتا ہے۔ ایک بہت ہی مشہور جرمن ڈرامہ نگار لیسنگ کے ڈرامہ ''عقلمند ناتھن'' کی اساس ایک اطالوی ڈرامہ ''ایک سو پرانے قصے'' (Cento novelle antiche) پر ہے لیکن مسلم ثقافت اور فکر کا اثر اطالوی اور یوروپین تہذیب کے صرف تحمل و برداشت کے مفہوم تک ہی محدود نہیں ہے۔ کسی بھی قوم کو یہ حق نہیں پہنچتا ہے کہ اسکے تمدن میں جو دوسرے کا حصہ ہے اسکو وہ غصب کر لے اور انسانی تہذیب کی تاریخ میں کسی بھی تمدن کے حصہ سے انکار کر دیا

جائے۔ مسلمانوں کے فلسفہ، فقہ و دینیات اور فنون لطیفہ کے اثرات یوروپ پر واضح ہیں۔لیکن اسکے علاوہ اہل یوروپ کے مزاج کو تازگی بخشنے اور صاف کرنے میں تنوع اور اعلیٰ اقدار سے مالا مال اسلامی ادب کا نمایاں کردار رہا ہے۔بطور مثال دانتے پر ابن العربی کے اثرات کو پیش کیا جا سکتا ہے۔خوش قسمتی سے اس موضوع پر یوروپ کے دانشوروں نے بہت کچھ کہا بھی ہے اور لکھا بھی ہے۔

اگر ماضی کی تاریخ کو مستقبل کی طرف کوئی اشارہ کئے بغیر دہرایا جائے تو وہ ایک بیکار علمی مشق ہوگی جبکہ اقوام عالم کی مدد اور عالمی حالات کی لازمی اصلاح کی خاطر یورپ اور اسلامی ممالک بالخصوص مسلم ممالک کے درمیانی تعلقات کی نوعیت کا اندازہ کرلیا جائے۔آخر ایسا کیوں؟ کیونکہ مسلمان اور یوروپین ایک دوسرے کے پڑوسی ہیں اور اقوام برخلاف افراد کے اپنے پڑوسی کا انتخاب نہیں کر سکتے۔لہذا اخلاقی، تہذیبی اور انسانی اسباب کے علاوہ اسلام اور یوروپ تاریخی اور جغرافیائی حالات کے اجبار کے تحت ایک دوسرے کو بہتر طور پر جانیں اور اسکے بعد اپنے اقتصادی، سیاسی اور ثقافتی تعلقات کو بڑھائیں۔ ہمارا مستقبل ناقابل تقسیم ہے جیسے کہ ہمارا ماضی ناقابل تقسیم تھا۔آج بھی ہمارے فلسفہ کی درسگاہوں میں افلاطون، ارسطو اور پلوٹینس اور جدید فلسفیوں میں ڈسکارٹ، کانٹ ہیگل اور وٹجینٹین کے افکار کو الکندی، فارابی، ابن سینا، سہروردی اور ملا صدرا کے خیالات کے ساتھ ہی ساتھ پڑھایا جاتا ہے۔آج اگر ایشیا کے عظیم تمدن اپنے آپ کو مغرب کے آئینہ میں دیکھتے ہیں اور ایک دوسرے کو مغرب کے نقطہء نظر سے سمجھنا چاہتے ہیں۔ ماضی میں اور وہ بھی ماضی قریب میں

اسلام نے مغرب کے لئے آئینہ کا کام کیا۔ اس آئینہ میں مغرب اپنے ماضی کو دیکھ سکتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے فکری اور تہذیبی ورثہ کا بھی بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے۔

اگر گفتگو فقط ایک انتخاب نہیں بلکہ یہ ہماری دونوں تہذیبوں کی ضرورت ہے تو پھر یہ گفتگو اسلامی ثقافت و فکر کے صحیح نمایندوں ہی سے کی جانی چاہیے اگر اس طرح کی گفتگو ان مغرب زدہ افراد سے جو مغرب کے بہت ہی کمتر درجہ کے اور برے نمونے ہیں، کیجائیگی تو اس مذاکرہ سے مغرب کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ مغرب زدہ مسلمانوں کے ساتھ مذاکرہ و گفتگو کو تہذیبوں کے درمیان گفتگو کا نام دینا تو بڑی بات ہے اس کو خود کلامی یا تنہا کلامی بھی نہیں کہا جا سکتا۔ آج کی دنیا کو جن مسائل نے گھیرے میں لیا ہوا ہے انکا صحیح عملی اور مبنی بر انصاف حل اسلامی تمدن سے بامعنی، عمیق اور باضابطہ گفتگو کے ذریعہ ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ خاندان کا بحران، انسان اور فطرت کے تعلقات میں بحران سائنسی تحقیق میں اخلاقی بحران، اور اس طرح کے بہت سے عنوانات اسلامی اور یوروپین گفتگو کے ایجنڈے میں شامل ہونے چاہیئے۔

گفتگو ایک پسندیدہ عمل ہے کیونکہ وہ آزادی اور آزادی خیال پر مبنی ہے۔ 'گفتگو' کے عمل میں کوئی ایک فریق اپنی رائے اور خیال دوسرے پر تھوپ نہیں سکتا۔ 'گفتگو' میں ایک فریق دوسرے فریق کی آزادانہ شخصیت، ان کے خیالات اور تہذیب کا احترام کیا جائے گا۔ صرف ایسی گفتگو کو ہی، امن، تحفظ اور عدل و انصاف کی جانب ایک ابتدائی قوم کی حیثیت حاصل ہوگی۔

ایران سے اس طرح کی گفتگو کے عمل کے بہت سے فائدے ہیں۔ ایک

طرف ایران یوروپ کا نزدیکی پڑوسی ہے اور دوسری طرف ایشیا کا پڑوسی بھی۔ ایران مشرق اور مغرب کی تہذیبوں کا سنگم ہے اس میں مشرقی روح اور مغربی تعقل پسندی کا اتصال دکھائی دیتا ہے۔ پس ایک فارسی نژاد کا قلب و ذہن درحقیقت توازن وتعادل، اور محبت وتحمل سے لبریز ہوتا ہے اسی وجہ سے ایرانی 'گفتگو' کے حامی ہیں اور امن وانصاف کے طرفدار۔

تیسرا باب

اسلامی دنیا اور جدید مسائل

اسلامی دنیا اور جدید مسائل ☆

حیران ہوں کہ میں اپنا بیان اس حزن و ملال اور بدنصیبی کے ذکر سے شروع کروں جو سر دست ہمارے سروں پر سایہ فگن ہے یا، اس مسرت اور خوشی کے اظہار ساتھ جو حاصل ہونے والی ہے۔ کیا اسلامی کانفرنس کے بنیادی مقاصد میں یہ نہیں ہے کہ مسلم ممالک کے رنج و غم اور ان کی مشکلات و پریشانیوں کا مشترکہ حل تلاش کیا جائے اور انکے شایان شان مقام و مرتبہ حاصل کیا جائے؟ اور کیا اس اعلیٰ مقصد کو حاصل کرنے کے لئے حال پر غلبہ اور بدنصیبیوں کا مداوا کیا جائے؟ دنیا کا کوئی بھی مرض اور درد اسوقت تک رفع نہیں ہو سکتا ہے جب تک مرض کی صحیح تشخیص نہ ہو، اس کے بعد دور اندیشی اور غور و فکر کے ساتھ اس کا حل تلاش کیا جائے اور اس کے بعد پورے آہنی عزم اور مستحکم ارادے سے اس پر عمل کیا جائے۔

ہماری حالت یہ ہے کہ امت مسلمہ جو ایک زمانہ میں علم، فکر اور تمدن کی علمبردار

☆ تنظیم اسلامی کانفرنس سے وابستہ اسلامی ممالک کے سربراہوں کے آٹھویں اجلاس سے صدر جمہوریہ اسلامی ایران اور صدر تنظیم جناب سید محمد خاتمی کا خطاب: تہران، ۹ر دسمبر ۱۹۹۷ء

تھی۔ مرض کی لگاتار واپسی کیوجہ سے حالیہ چند صدیوں کے دوران روز بروز پسماندگی اور کمزوری کا شکار ہوتی چلی گئی اور غالب ومتکبر عصری تمدن کے مقابلے میں لگاتار جمود و درد انگیز بے حسی و مایوسی کی وجہ سے نہ صرف اس تہذیب کے نتائج سے فائدہ حاصل کر سکی، بلکہ پوری طرح ناکام ہوکر رہ گئی۔ ہمارا صدیوں پرانا جمود درحقیقت اس انسانی تہذیب کے زوال کا نتیجہ ہے جو ایک درخشاں ماضی کی حامل ہے اور جس کی کامیابیاں اور یادیں آج بھی لائق تحسین ہیں اور موجودہ دنیا کا غالب تمدن آج بھی جس کا مرہون منت ہے۔

آج کے دور میں پرانے تمدن کا نہ نقش ثانی بنانا ممکن ہے اور نہ ہی مناسب، کیونکہ اسکا وقت گزر چکا ہے۔ تمدن کو انسان کے وجود، دنیا اور خود اس کے وجود کے سلسلہ میں سوالات کے جوابات کا حاصل مانا جائے اور ساتھ ہی ساتھ اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے سلسلہ میں کوششوں کا ماحصل بھی یہی ہے۔ انسان میں مسلسل جاننے کی لگن، اسکی ضروریات آرزوئیں۔ لیکن سوالات اور ضروریات کی شکل اور محتویات زمان ومکان کے ساتھ بدل جاتے ہیں۔ تمدن اس وقت زندہ و پایندہ رہتے ہیں جب تک وہ انسان کے بدلتے ہوئے سوالات کے جوابات اور بدلتی ہوئی ضروریات کی تکمیل کی صلاحیت رکھتے ہیں، ورنہ وہ ختم ہو جاتے ہیں۔ اس طرح تمدن بھی انسانوں کے معاملات کی طرح وجود میں آتے ہیں، ترقی کرتے ہیں اور ختم ہو جاتے ہیں۔

ہمارے عہد میں انسان کے سوالات اور احتیاجات ہمارے متقدمین سے مختلف ہیں۔ اس عہد میں ہمارا جمود اور بے حسی مغربی تمدن کے مقابلے میں۔ جو

مغرب کے انسان کے سوال کا ایک قدرتی جواب ہے۔ وہ اس بات کا غماز ہے کہ مختلف اسباب کی بناء پر ہم نے سوال کرنا بند کر دیا ہے۔ سوال کا نہ ہونا غور و فکر کے نہ ہونے کا سبب ہے جس کے نتیجہ میں ایک ناگزیر جمود اور دوسروں کی تابعداری و اطاعت کے مانند ہے۔

اہم یہ ہے کہ اس طرح کے جمود، پستی اور پسماندگی کو خیر باد کہہ دیا جائے کیونکہ یہ کوئی ہماری تقدیر میں نہیں لکھا ہوا ہے۔ وہ لوگ جو تاریخ میں ایک شاندار اور عظیم الشان تمدن وجود میں لائے، ان میں آج بھی ایک دوسرے تمدن کو وجود میں لانے کی صلاحیت ہے، بشرطیکہ وہ تعقل پسندی اور سوچ بچار و غور و فکر کو اپنائیں اور اس کا حصول تب ہی ممکن ہے جب وہ مندرجہ ذیل باتوں کو ملحوظ رکھیں۔

۱۔ غور و فکر کے ساتھ اس تاریخی وجود کی جانب بازگشت و واپسی جو ایک طرف تو ابدی روحانیت میں الہام بخش ہے اور دوسری جانب ماضی کی پرورده وہ منفرد تاریخی اور تہذیبی صلاحیت ہو۔

۲۔ موجودہ زمانہ کا گہرا اور صحیح مطالعہ: اس سلسلہ میں یہ جاننا لازمی ہے کہ اسلامی تمدن بلکہ درست تر عبارت میں مسلمانوں کے تمدن اور ہماری زندگی۔ دونوں کے درمیان مغربی تمدن حائل ہے۔ ایک ایسا تمدن جس کی کامیابیاں زیادہ ہیں اور جس کے منفی نتائج بھی غیر مغربی لوگوں کے لئے بے شمار ہیں۔ ہمارا عہد مغربی تہذیب و تمدن کے غلبہ کا زمانہ ہے۔ پس اسکی موثر اور مفید فہم و درک کے لئے اسکی سطحی اور سرسری مطالعہ کے بجائے اسکی نظریاتی اساس اور بنیادی اقدار کو جاننا ضروری ہے۔

اپنے ماضی کو تسلیم کرنا لازمی ہے۔ اس لئے نہیں کہ ہم اپنے ماضی کی طرف لوٹ جائیں یا اس میں رہنے لگیں، رجعت پسندی ہو گی بلکہ اس لئے کہ اپنی شناخت کے جوہر اور انداز فکر اور عادات کے سدھار کے لئے جو زمان و مکان کی وجہ سے پختہ ہو گئی ہیں۔ اسی طرح ماضی کی ایک عاقلانہ تنقید تا کہ آج عزت اور وقار کو مناسب مدد مل سکے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ایسا پلیٹ فارم بھی ہو جہاں سے ہم ایک خوش آیند اور تابناک مستقبل کی طرف بڑھ سکیں جو یقیناً ہمارے ماضی سے بھی بہتر ہو۔ بلاشک ہم اسی راستہ پر چلکر آگے کی طرف بڑھ سکتے ہیں جسمیں مغربی تمدن کی مثبت سائنسی تکنیکی اور سماجی کامیابیوں سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت اور ضروری دیانت داری موجود ہو۔ یہی وہ صورتحال ہے جس سے گزرتے ہوئے مستقبل تک پہنچا جا سکتا ہے۔ تکلیف دہ اور تلخ ہی سہی لیکن مسلم ممالک کا جمود، ان پر طاری بے حسی اور پسماندگی ہمیں یاد دلاتی ہے کہ ہم اپنی قسمت کو بیداری، عزم اور اتحاد کے ذریعہ بدل سکتے ہیں اور یہ اطمینان اور مسرت کی بات ہے۔

یقیناً ہم بہتر باہمی افہام و تفہیم، بلند نگاہی اور برادرانہ جذبات کے ذریعہ اپنی موجودہ اور آئندہ نسلوں کو جدید اسلامی تمدن کی طرف راغب کر سکتے ہیں، اس منصوبے کو عملی اور حقیقی روپ دینے کے لئے ہم لوگوں کو باہمی اتحاد اور ہم خیالی سے کام لیتے ہوئے اپنے اپنے ملک میں اسلامی مہذب معاشرہ تعمیر و تخلیق کرنی ہو گی۔ جس مہذب معاشرہ کی ترویج اور تکمیل ہم اپنے معاشرہ میں کرنا چاہتے ہیں اور جسکی ترویج کی سفارش ہم دوسرے اسلامی معاشروں میں کیا کرتے ہیں، وہ بنیادی طور پر

اس مہذب معاشرہ سے مختلف ہے جس کی جڑیں یونانی فلسفہ وفکر اور رومی سیاسی روایت میں قرون وسطیٰ کی گہرائیوں میں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں اور جسکی موجودہ دور میں خصوصی شناخت اور ترتیب ہوگئی ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے مخالف یا متضاد نہیں ہیں، خواہ نتائج کے اعتبار سے ہو یا ظاہری ہیئت کے اعتبار سے۔ اسی وجہ سے ہمیں مغربی مہذب معاشرہ کی مثبت کامیابیوں کو جو قانونی اعتبار سے حاصل کی گئی ہیں، فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔

مغرب کا مہذب معاشرہ تاریخی یا نظریاتی اعتبار سے یونان کی شہری ریاست، اور بعد ازاں رومن سیاسی نظام سے مشتق ہے جبکہ ہمارے ذہن میں مہذب معاشرہ کا آغاز اسکا نظریاتی اور تاریخی پس منظر شہر نبوی کے آغاز سے ہوتا ہے۔ یثرب کا نام بدل کر مدینتہ النبی رکھنا صرف نام کی تبدیلی نہیں تھی اور نہ ہی جاہلیت کے دور (ایام جاہلیہ) سے ایام اللہ میں داخل ہونے میں کوئی منصب بدلنا ہے کیونکہ مدینہ خاک اور علاقہ کا نام نہیں جیسا کی یوم اللہ کسی خاص وقت کے لئے نہیں۔

مدینتہ النبی اور ایام اللہ اسلام کے اوائل میں رونما ہوئے اور اسلام کے اخلاقی جغرافیہ اور تاریخ نے نئے نقطہ نظر، کردار اور تہذیب کو جنم دیا۔ یہ تہذیب اپنے منفرد اور خاص نقطۂ نظر کے ساتھ وجود انسان اور انکی ابتداء کے بارے میں صدیوں تک ان کے اجتماعی حافظہ اور روح کی گہرائیوں میں بسی رہی۔ اب مسلمانوں کو اپنے گزرے ہوئے کل سے زیادہ اپنے مشترک گھر میں پناہ لینی ہے، جبکہ مسلمانوں کے نسلی، جغرافیائی اور معاشرتی اختلاف انفرادی اعتبار سے ایک مسلمان کو مختلف زمانوں میں

جدا جدا شباہت اور رنگ و بو دیتے رہے ہیں۔ مدینۃ النبی ہمارے لئے ایک ابدی اخلاقی گھر ہے اور 'یوم اللہ' ہماری پوری زندگی میں ایک برق کی مانند دوڑ تا رہتا ہے اور یہی ہونا بھی چاہئے۔ مدینہ ہجرت کیوجہ سے وجود میں آیا، یعنی جب آپ نے شرک اور ظلم کی سرزمین کو خیر باد کہا تب یوم اللہ کا آغاز ہوا۔ جاہلیت کے دور سے لاتعلق ہونے کا (تاریکی کو ترک کرنے کا) اور روحانی زمان اور حاضری کی مقدس مملکت میں داخل ہونے کا اور ''مشترک اسلامی گھر'' میں پناہ لینے کا مطلب مراجعت، سائنسی کامیابیوں کی تردید، جدید دنیا سے دست برداری یا دوسروں سے مقابلہ آرائی ہرگز نہیں ہے بلکہ اس کے برخلاف اس طرح کی بازگشت اپنی مشترک شناخت کی طرف بازگشت ہے تا کہ اس کے بعد ہم دنیا کے دوسرے لوگوں اور قوموں کے ساتھ امن و امان اور آرام سے رہ سکیں۔ امن اور حفاظت سے رہنا تب ہی حاصل ہوسکتا ہے جب تہذیب اور فکر کا پورا ادراک ہو اور اسکے ساتھ ہی ساتھ دوسروں کے رسم و رواج اور ان کے افکار و خیالات سے بھی آگاہی ہو۔ دوسرے معاشروں اور اقوام کے تہذیبی اور اخلاقی پہلوؤں کی فہم اور ادراک ہی ان قوموں سے ''گفتگو'' کی امید دلاتا ہے۔ ایک حقیقی اور بامعنی مکالمہ اور بات چیت تب ہی ہوسکتی ہے جب کہ متعلقہ فریق اپنے صحیح اور درست مقام کو حاصل کرلیں ورنہ ایک اجنبی اقوال اور دوسروں کے مابین گفتگو بے معنی اور یقیناً کسی فائدہ اور خوبی سے عاری رہیگی۔ مشترک اسلامی گھر مدینۃ النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں داخل ہونے کا مطلب مسلمانوں کو اپنا صحیح مقام و مرتبہ حاصل کرنا ہے یعنی ان لوگوں کو اپنی حقیقی یعنی ان کی پوری اسلامی شناخت حاصل کرنا ہے۔

وہ مہذب معاشرہ جسکی ہم حمایت کر رہے ہیں اگر چہ وہ اسلامی تہذیب اور فکر کے محور کے ارد گرد گھومتا ہے۔ اس میں انفرادی یا گروہی انانیت یا اکثریت کے مظالم اور اقلیت کا اخراج ان سب کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس طرح کے معاشرہ میں انسان صرف انسان ہونے کی وجہ سے معزز و محترم ہے اور اس معاشرہ کے شہری اپنی قسمت کا فیصلہ خود کرتے ہیں۔ حکمراں پر نظر رکھتے ہیں اور حکومت کا محاسبہ کرتے ہیں۔ اس معاشرہ میں حکومت لوگوں کی خدمتگزاری میں لگی رہتی ہے اور صرف ان پر حکم نہیں چلاتی ہے۔ ہر سلسلہ میں لوگوں کے سامنے جوابدہ ہے کیونکہ خدا نے عوام کو اپنی تقدیر کا فیصلہ کرنے کا حق دیا ہے۔ ہمارے مہذب معاشرہ میں صرف مسلمانوں کو ہی حقوق حاصل نہیں یا صرف ان کو ہی شہری نہیں سمجھا جاتا ہے بلکہ جملہ افراد کے حقوق قانون اور نظم کے دائرہ میں ہیں۔ اس طرح کے حقوق کا دفاع، حکومت کے اہم بنیادی فرائض کو مرتب کرتا ہے۔

انسانی حقوق کا احترام اور اس کے معیاری اصول کو تسلیم کرنا نہ تو سیاسی مصلحت ہے اور نہ ہی دوسروں کی مشابہت بلکہ یہ تو ہمارے مذہب کی تعلیمات اور احکامات کے مطابق ہے۔ امیر المومنین امام علی (ع) نے اپنے ایک نمائندہ کو حکم دیا کہ وہ صرف مسلمانوں کے ساتھ ہی نہیں بلکہ جملہ عوام کے ساتھ عدل اور برابری کا سلوک کرے کیونکہ سماج کے دو گروہوں میں سے ایک گروہ تمہارا دینی بھائی ہے لیکن دوسرا گروہ خلقت میں تم جیسا ہے۔

ہمارا مذہبی معاشرہ نہ تو دوسروں پر حکومت کرنا چاہتا ہے اور نہ ہی کسی دوسرے

کے غلبہ کو تسلیم کرتا ہے۔ وہ دوسری اقوام کے خود فیصلہ کرنے اور ضروری وسائل تک ان کی رسائی کے حق کو ایک باعزت زندگی کے لئے تسلیم کرتا ہے۔ کسی بھی طاقت اور جبر کے آگے نہ جھکنے کا ٹھوس ارادہ رکھتے ہوئے اپنے پیروں پر خود کھڑا ہونا ہے۔ ہمارا مہذب معاشرہ قرآن کی تعلیم کے مطابق موجودہ تمام تکنیکی ترقی کے ضروری ذرائع و وسائل کے حصول کو اپنا حق مانتا ہے اور دوسروں کے غلبہ اور ماتحتی کی تردید کرتا ہے۔ بیشک قوموں کے تعلقات میں طاقت کے استعمال اور منافقت اور دوہرے رویہ کی تردید کرنا اور اسکے بدلے بین الاقوامی تعلقات میں باہمی عزت واحترام کے اصول اور منطق کو اپنانا ہے۔ وہ مہذب معاشرہ جس کے لئے ہم جدوجہد کررہے ہیں، وہ ہماری اجتماعی شناخت پر مبنی ہے جس کے حصول کے لئے مفکرین اور دانشمندوں کی پیہم اور لگاتار کوششیں درکار ہیں۔ یہ کوئی ایسا خزانہ نہیں ہے جسکو رات ہی رات کھود کر نکال لیا جائے بلکہ یہ زندگی اور اخلاق کا ایک ایسا سرچشمہ ہے جس کا بہاؤ ہمارے لئے مفید ہوگا۔ لہذا اس خزانہ کی مسرت اور لذت آہستہ مگر لگاتار ہے اور اس پر بھی مبنی ہے کہ اصولی طور پر اسکو تسلیم کیا جائے اور اپنی میراث کو دوبارہ ٹٹولا جائے۔ ایک طرف ہماری اصولی اور دانشورانہ روایت ہے اور دوسری طرف آج کے زمانہ کا سنجیدہ سائنسی اور فلسفیانہ ادراک وشعور ہے۔ قدرتی امر ہے کہ اہل فکر اور اہل علم ودانش کا ہی قائدانہ اور مرکزی کردار اس پوری تحریک میں کارفرما رہا ہے اور اس سلسلے میں ہماری کامیابی کا انحصار اس پر ہے کہ سیاست فکر اور اخلاق کی تابع ہو اور ایسا نہ ہو کہ محدود دائرہ میں ان کی تابع ہو کر کام کرے۔

میں نے جو بات ابھی عرض کی ہے وہ صرف خیالی مشق نہیں ہے بلکہ مستقبل کی گھومنے والی تصویر ہے۔ اسکا حصول ممکن ہے اور اسکے حصول کی کوشش کرنا ہمارا اولین فریضہ ہے۔

یہ ہمارا عقیدہ ہے کہ ایران میں اسلامی انقلاب کی کامیابی اس راہ پر گامزن رہنے کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے۔ ایران کے معزز اور محترم عوام پوری خوداعتمادی اور پوری ثابت قدمی کے ساتھ اس راہ پر چل رہے ہیں۔ اگرچہ ایک طرف مشکلات کا مقابلہ اور داخلی طور پر لوٹنے کی عادتیں اور بنے ہوئے ذہنی میلانات اور دوسری جانب خارجی دباؤ اور سازشیں ہیں لیکن پھر بھی اس راہ پر چلتے ہوئے ایرانی عوام دنیا کی تمام مسلمان اور دوسری اقوام اور ملکوں کو بھی باہمی تعاون اور اخوت کا ہاتھ بڑھا رہے ہیں۔

اسلامی احترام اور وقار کی بازیابی جس خداوند قدوس نے ہمارے لئے مقرر کی ہے اسکو حاصل کرنے کیلیئے لازمی صلاحیتوں کے ساتھ موجودہ دنیا کے سامنے ہم اپنا دعویٰ پیش کر سکیں اور ایک نئے تمدن کی تشکیل و تعمیر میں ہم سرگرم کردار بھی ادا کر سکیں یا کم از کم اس نئی تہذیب کی تشکیل میں کچھ حصہ لیں جو موجودہ تمدن کی جگہ اختیار کرنے والی ہے۔ اس سلسلہ میں ہم مسلمانوں کو دو اہم باتوں پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔ اول: عقل و استدلال اور دوم اتحاد و اتفاق۔ ان دو عظیم مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے پیغمبر عظیم الشان کی قیامت تک باقی رہنے والی میراث ''مقدس قرآن'' کی طرف ہمہ تن توجہ کے علاوہ ہمارے پاس دوسری کوئی چیز نہیں ہوسکتی ہے۔ ایک بہت ہی اہم

اور شاندار ورثہ اسلام جو پیغمبر نے ہماری رہنمائی کے لئے چھوڑا ہے۔ دنیا کی کس مقدس آسمانی کتاب یا پیغام نے قرآن سے زیادہ اس بات پر زور دیا ہے کہ دنیا اور دنیوی تخلیق کے بارے میں تعقل پسندی، غور وفکر، سوچ بچار اور دقت نظر سے کام لیا جائے اور گذشتہ اقوام اور لوگوں کے انجام کو نظر میں رکھا جائے اور ان سے سبق لیا جائے۔ مزید برآنکہ تمام قومی، نسلی، لسانی اور مذہبی اختلافات کے سلسلہ میں بھی قرآن پر اعتماد اور بھروسہ کرنا چاہیئے۔ مسلمانوں کو اتحاد و اتفاق کی تلقین کرنے والا اور سب سے زیادہ قابل اعتماد وسیلہ ہے۔ آج بھی قرآن کریم کی چمک دار شعائیں اور کرنیں ہمارے مستقبل کے افق کو روشن کر سکتی ہیں لیکن واضح رہے کہ اس سلسلے میں ضد اور عادت پرستی سے ہرگز کام نہ لینا چاہئے اور دوسری طرف اپنے مقابلے میں دیگر قوموں کو حقارت کی نظر سے ہرگز نہ دیکھنا چاہیئے۔ بلکہ کسی احساس کمتری کے بغیر ہمیں آگے بڑھنا چاہیئے۔

اس موقع پر اور اس محترم اجلاس میں اپنے معزز سامعین کی خدمت میں برادرانہ احساسات کے ساتھ مسلم ممالک کے لئے وہ ترجیحات پیش کرتا ہوں جو مسلم ممالک کے لئے لازمی ہیں اور جن کے ذریعہ۔ بعد میں وہ اپنے مسائل کا علاج کر سکتے ہیں اور اس سلسلے میں میں کانفرنس سے ہر ممکن تعاون کی درخواست کرتا ہوں۔

ا۔ ایک جدید اور منصفانہ عالمی نظام کی جانب

اگر چہ امریکی ماہرین سیاست دوسروں پر اپنی مرضی تھوپنے کی کوشش میں ہمہ تن سرگرم ہیں۔ اور سردست دنیا کی اکلوتی طاقت کی حیثیت سے ہونا بھی یہی چاہئے

کہ ساری دنیا اس کے اردگرد گھومتی رہے۔ بین الاقوامی تعلقات گذشتہ دو قطبی نظام سے نکل کر تاریخ کے ایک نئے دور میں داخل ہو رہے ہیں۔ ہمارے اعتبار سے عالمی سطح پر ایک نیا نظام ابھر کر سامنے آ رہا ہے جو کثرت پر مبنی ہے اور جسمیں انشاء اللہ ایک قطبی نظام کی اجارہ داری نہیں ہوگی۔ ہم مسلم ممالک کے لئے لازمی امر یہ ہے کہ ہم دلیری اور بہادری سے توسیع پسندی کا مقابلہ کریں اور ہمیں کوشش کرنی چاہیئے کہ دنیا کے نئے سیاسی نظام اور بین الاقوامی تعلقات کی تعمیر و تشکیل میں ہمارا بھی حصہ ہو اور ہم اس سلسلہ میں اپنے مقام اور مرتبہ کو محفوظ رکھنے کے لئے کوشش کرتے رہیں۔ اس کے لئے لازمی سوجھ بوجھ، منصوبہ بندی اور مشترکہ کوشش کی ضرورت ہے۔

مسلم ممالک کے لئے لازمی ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں نیز اپنی حیثیت کا بخوبی جائزہ لیں اور خارجی ماحول کا بھرپور تجزیہ اور محاسبہ کرتے ہوئے ایسی سیاسی حکمت عملی اپنائیں جس سے وہ اپنے داخلی وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے سیاسی اتحاد اور استحکام حاصل کرسکیں اور اس طرح سے بین الاقوامی فیصلوں میں اپنی شرکت کو یقینی اور موثر بنائیں۔ ابتدائی طور پر اپنے اصولوں پر بھروسہ کرتے ہوئے مشترکہ میراث و مصالح، اور صلح وصفائی کو مدنظر رکھیں اور کوشش کریں کہ ہمارے نظریات مختلف شعبوں میں نزدیک ہو جائیں اور اسکے بعد کوشش کریں کہ اپنی صلاحیتوں کو بھرپور طریقہ سے بروئے کار لاتے ہوئے ایک مضبوط اور مربوط زنجیر کو وجود میں لے آئیں۔

۲۔ عالمی اور علاقائی صلح وسلامتی

ایک جدید انسانی عالمی نظام کی تشکیل میں مشترکہ کوشش اسلامی دنیا کا تاریخی

مشن رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی عالمی و علاقائی سطح پر صلح و سلامتی قائم کرنے کے لئے مسلم ملکوں کے درمیان مکمل اور بھرپور تعاون یقیناً ایک ناقابل تردید ضرورت ہے۔

بہر صورت دنیا میں دیرپا امن و سلامتی اور انسانی تحفظ کی فراہمی کیلئے سرد جنگ کا جو نمونہ موجودیت ضرورت کے تحت عالم وجود میں لایا گیا تھا-عوام کی رائے کی خاطر-اس خیالی و خارجی دشمن کو اب ایک طرف رکھ دیا جائے ۔ یہ تو بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ بعض توسیع پسندانہ قومیں دنیا میں اسلام کے ایک خیالی مخالف اور دشمن کی تخلیق کی خواہاں ہیں۔ اس لئے یہ بات لازمی ہے کہ عالمی اور علاقائی سطح پر امن و سلامتی کے فروغ میں ہماری شرکت مؤثر اور مسلسل ہو۔ اعتماد میں اضافہ، امن وسلامتی کے بارے میں پریشانی میں کمی اور اسلام کے دشمنوں کی جانب سے غلط پروپیگنڈے کو بے اثر بنانا لازمی ہے، ہمیں ہوشیار رہنا چاہیئے ۔ ہماری سلامتی کے لئے سب سے بڑا خطرہ مسلمانوں کے سیاسی، تہذیبی اور اقتصادی وجود کے خلاف بڑھتی ہوئی دھمکیوں کا رجحان، خاص طور سے ان دھمکیوں میں توسیع اور تشدد، اور امت مسلمہ کے عقیدے اور ان کی تاریخی شناخت کی جانب توجہ، تہذیبی جملوں اور تجاوز میں توسیع کا آغاز، ان سب کے نتیجہ میں ہم مسلمان بہت ہی حساس اور خطرناک صورتحال سے گزر رہے ہیں اور اس دنیاوی خطرہ و دھمکی کے مقابلے کے لئے ہمارے مستحکم اتحاد و اتفاق کی راہ میں کسی قسم کی رخنہ اندازی برداشت نہیں کی جانی چاہیئے۔

آج کی دنیا میں جو ایک دوسرے پر منحصر اور ایک دوسرے کی تابع ہے اور جہاں مختلف خطوں اور علاقوں کی سلامتی ناقابل تقسیم ہے، باہمی اعتماد کو بڑھانا اور

امن قائم کرنے کے لئے کوشش کرنا پوری دنیا کی ذمہ داری سمجھی جاتی ہے۔ امن و سلامتی کو یقینی بنانے کیلئے اعتماد کو بحال کرنا بنیادی اور مناسب ترین طریقہ کار ہوسکتا ہے۔ باہمی اعتماد کی بحالی اور امن وسلامتی کے بارے میں غور وفکر اور اس کے سلسلے میں پائی جانے والی پریشانی میں کمی کے لئے زمین فراہم کرنا مسلم ملکوں کے درمیان باہمی تعلقات میں ان چیزوں کو سب سے زیادہ اہمیت دی جانی چاہئے اور یہی اسلامی کانفرنس تنظیم کا ایجنڈا بھی ہونا چاہیئے۔

اسلامی دنیا اور دیگر ممالک میں تعلقات کی بنیاد بھی عدم اعتماد، غلط فہمی اور مخالفت کے تصورات پر مبنی ہے۔ اس میں کچھ تو تاریخی اسباب کی وجہ سے ہے اور کچھ کا سب حکومت اور تسلط کے جذبہ کے تحت تعلقات کا نتیجہ ہیں۔ ان پرانی غلط فہمیوں کو ہوا دینے کی غرض سے حکمراں اور تسلط کرنے والے غلط فہمیوں کو بڑھاوا دیتے رہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں تمدنوں اور تہذیبوں گفتگو کے لئے زمین ہموار کی جانی چاہئے اور اس مقصد میں دانشور طبقہ اہم کردار ادا کرسکتا ہے۔ بہرحال اس کام کے لئے ہم ایک راستہ بنیادی افہام وتفہیم کا کھولیں جس سے حقیقی امن وسلامتی کی بنیاد قائم ہوتی ہے اور جو دراصل تمام قوموں کے حقوق کو تسلیم کرنے کی اساس پر مبنی ہے اور عوامی رائے میں منفی پروپگنڈے کے اثرات کی بنیاد کو ہی کمزور اور بے اثر کردیتا ہے۔

آج کی دنیا کو امن وسلامتی درکار ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ پائیدار امن انصاف اور باہمی احترام کی بنیاد پر ہی قائم ہوسکتا ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ امن و سلامتی کی مہم میں درحقیقت انصاف اور متاثرہ لوگوں کی خواہشات کے احترام کے

بغیر کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ جیسا کہ مشرق وسطیٰ کے مسئلہ نے واضح کر دیا ہے کہ حقیقی امن تب ہی قائم کیا جا سکتا ہے جب فلسطینی عوام کے جائز حقوق کو تسلیم کر لیا جائے، جسمیں ان کا نا قابل تردید حق استصواب عامہ، فلسطینی، مہاجرین کی واپسی اور مقبوضہ علاقوں، بالخصوص بیت المقدس کی آزادی امن کی ضامن ہو سکتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ غاصب، نسل پرست اور جلاد صفت صیہونی حکومت کی زور آوری، بین الاقوامی قاعدوں اور قانونوں کی شدید خلاف ورزی، حکومتی دہشت گردی، ایٹمی اور جوہری توانائی سے مالا مال ہتھیاروں کی تیاری، خطہ کے امن و امان کے لئے ایک خطرناک دھمکی ہے۔

خلیج فارس جیسے فوجی اہمیت کے حامل اور حساس علاقہ میں علاقائی ریاستوں کو امن وسلامتی کی ذمہ داری خود نبھانی چاہیئے۔ ہمارے نظر میں ایسے حساس علاقوں میں غیر ملکی فوجوں اور بحری بیڑے کی موجودگی نہ صرف عدم استحکام و تناؤ کا سبب بنتا ہے بلکہ ہولناک ماحولیاتی نتائج اور آلودگی کو بڑھاوا ملتا ہے۔

افغانستان کی پیاری سرزمین میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ ایک عظیم انسانی المیہ ہے اور یہ سرزمین غیر ملکی مداخلت اور تمام خطہ میں استحکام وسلامتی کو درہم برہم کرنیوالے علاقے میں تبدیل ہو چکی ہے۔ مسلم ممالک اور اسلامی کانفرنس تنظیم کو اصرار کرنا چاہیئے کہ مسئلہ افغانستان کو فوجی وسائل کے ذریعہ حل نہیں کیا جا سکتا۔

اس ملک کی دردناک حالت کی حقیقی اصلاح کے لئے اول تمام متعلقہ گروہوں میں افہام و تفہیم کی ضرورت ہے اور اس کے بعد باہمی عہد و پیمان اور افغانی عوام کی

شرکت کے ذریعہ حل تلاش کرنا چاہیئے ۔ اسلامی کانفرنس امن وسلامتی کے حصول کے لئے اس ملک کی رہنمائی اور مدد کرے اور سب ہی فریقوں کو بلا کر معاہدہ میں شامل کرے۔

عراق میں صورتحال خاص طور سے ملک کے شمال میں پریشانی اور فکر مندی کا سبب ہے۔ اس سلسلے میں عراق کو بین الاقوامی اداروں کے ساتھ پورا تعاون کرنا چاہیئے ۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ غیر ملکی مداخلت کیوجہ سے خاص طور سے اس علاقہ میں جھگڑا اور جنگ کا ماحول پیدا ہوگیا ہے جسکے نتیجہ میں لاکھوں شہری بے گھر ہو گئے ہیں، اور اس خطے میں عدم استحکام کی صورتحال پیدا ہوگئی ہے ۔ ہم عراق کے علاقائی اتحاد کو اہمیت دیتے ہیں اور اپنی آمادگی ورضامندی کا اعلان کرتے ہیں کہ اس اہم ملک میں تمام انسانی مسائل کو حل کرنے کے لئے لازمی اقدامات کئے جائیں۔

غیر ملکی مداخلت اور دوسروں کے معاملہ میں ٹانگ اڑانے کا خطرناک منصوبہ، خاص طور سے اسرائیل کی طرف سے ہمارے علاقے کے اکثر حصوں میں موجود دہشت گردی اور تناؤ ہمارے لئے بہت ہی تشویش کی بات ہے۔ ہم علاقے کے تمام ممالک کو آگاہ کرتے ہیں کہ وہ ہوشیار رہیں۔ ہماری مرکزی ایشیائی اور کوہ قاف کے علاقہ کی حکومتیں جو خود کو منوانے والی موجودگی اور پورے وقار اور عزت وافتخار کے ساتھ آزادی اور ترقی کی راہ پر گامزن ہیں ہم اسلامی دنیا میں ان کو خوش آمدید کہتے ہیں۔اس موقع پر تاجکستان جیسے برادرانہ اور دوست ملک میں امن وسلامتی کے رحجان کا استقبال کرتے ہوئے میں لازم جانتا ہوں کہ صدر رحمانوف اور جناب عبداللہ

نوری، چیرمین نیشنل ریکنسیلیشن کمیشن کا شکریہ ادا کروں کیونکہ امن کے قیام میں ان دونوں نے بھرپور مدد کی۔ تاجیکستان میں مزید امن وسلامتی حاصل کرنے کے لئے جمہوریہ اسلامی ایران، اسلامی کانفرنس تنظیم کو مدعو کرتی ہے کہ وہ اس ملک میں امن کے قیام کے عمل کو مضبوط کرے اور اپنی پوری کوشش کرے کہ وہاں نسلی اختلاف نہ پھیل سکیں۔

آجکل بعض اسلامی ممالک غیر ملکی دھمکیوں اور شازشوں سے دوچار ہیں اور اپنے داخلی اختلاف کی سازشوں اور پریشانیوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اسلامی کانفرنس بالعموم اور اسلامی ممالک بالخصوص ان ممالک کی آزادی اور دیگر مفاد ومنافع کے سلسلہ میں اپنی مکمل تائید اور بھرپور حمایت کا اعلان کریں۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ مسلم اقوام کی خواہشات اور آرزوؤں کے احترام کا بھی اعلان کریں۔ اس کے علاوہ اسلامی کانفرنس تنظیم کو اس طرح عمل کرنا چاہیئے اور اس راہ پر چلنا چاہیئے کہ مسلمان دنیا کے کسی بھی علاقہ میں ہوں بشمول وہ مسلم اقلیتیں جو غیر مسلم ممالک میں رہتی ہیں، اس تنظیم پر مکمل اعتماد وبھروسہ رکھیں اور انھیں اس تنظیم سے لازمی و یقینی مدد مل سکے۔

۳۔ اسلامی ممالک کی بھرپور، متوازن اور مسلسل ترقی

اسلامی معاشروں کا تحفظ 'استحکام اور ان کی آزادی اور اسی طرح سے مسلم اقوام کی عزت اور ان کے وقار کی اساس ترقی ہے۔ ہماری رائے میں مناسب اور بعض سلسلہ میں ترجیحی ترقی بھرپور 'متوازن' اور مسلسل ہونی چاہیئے جس میں سماج کے تمام افراد مثلاً خواتین اور نوجوانوں کی شرکت لازمی ہے۔ دوسرے حصہ بھی شرکت

کریں بشمول عورتیں اور جوان۔ترقی کی یہ تعریف بیان کی گئی ہے کہ انسان کو اس میں مرکزی نقطہ ہونیکی حیثیت حاصل ہے۔اسکی مادی اور روحانی زندگی کی برکتوں سے حاصل ہونے والی مسرتیں اور خوشیاں ہی ترقی کی اساس اور بنیاد ہیں۔

اس طرح کی ترقی کے لئے سب سے پہلے ترقی کے ایسے ماڈل اور نمونے کی ضرورت پڑتی ہے جو ہمارے معاشرہ سے میل کھاتا ہو۔ ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا چاہیئے کہ کوئی بھی ملک ترقی کی راہ کی سب مشکلات پر خود قابو نہیں پا سکتا ہے۔اس کے علاوہ اسلامی ممالک کے لئے لازمی ہے کہ وہ اپنے امکانات اور صلاحیتوں کا بھرپور دقیق اور سائنسی طریقہ سے جائزہ لیں اور ان صلاحیتوں کو وجود میں لانے کیلئے ایک دوسرے کی مدد کریں -اپنے تقابلی منافع سے بھرپور استفادہ کرتے ہوئے -اسلامی دنیا میں ترقی کے کاموں کا ایسا حلقہ جو ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہو، وجود میں لے آئیں اس کے ساتھ ہی ساتھ خدا کے عطا کئے ہوئے سرمایہ اور ذرائع کا پورا استعمال کریں۔اس اہم مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے عمدہ انتظام اور علمی تکنیک اور انسانی قوت سے استفادہ کیا جائے۔اس کے لئے مناسب ہمکاری اور اقتصادی، سائینسی اور تکنیکی میدانوں میں تبادل اور اسکے ساتھ ہی خصوصی اور مہارت رکھنے والے ماہر کاریگروں کا تبادلہ بھی ضروری ہے۔ان اقدامات کے ذریعہ اسلامی دنیا یقیناً موجودہ اور آئندہ زمانہ میں ترقی، قدرت واقتدار کا اہم قطب بن جائے گی۔

مسلم ممالک میں موجودہ مذہبی پیوند، روحانی قربتیں اور مشترک تہذیبی ورثہ کی تکمیل اگر سائنسی، اقتصادی اور تکنیکی تبادلہ اور تعلقات سے ہو جائے تو یقیناً ضروری

مادی اور اخلاقی بنیاد مل جائیگی اور یہ ایک ترقی پسند، اعلیٰ اور پر امن معاشرہ کا ستون بن جائیگا اور ان ملکوں کو اجتماعی ترقی اور سلامتی حاصل ہو جائے گی۔

۴۔ اسلامی کانفرنس تنظیم کے کردار کا دوبارہ جائزہ

اسلامی کانفرنس تنظیم ہی پوری اسلامی دنیا میں واحد عالمی لیکن چند جہتی تنظیم ہے جسکا مذکورہ بالا مقاصد کے حصول میں اہم کردار رہا ہے اور جو بالعموم بنیادی مقصد شرکت گفتگو اور ترقی کو بروئے کار لائی ہے۔ گذشتہ دہائی میں بالعوم مذہب کا انسانی معاشرہ کی تعمیر و ترقی میں اور بالخصوص اسلام کا خصوصی کردار رہا ہے اور ان انسانی تعلقات کو نگاہ میں رکھتے ہوئے دنیا بھر کے مسلمان حق بجانب ہیں کہ وہ اپنی اسلامی انسانی اور بین الاقوامی ضرورتوں اور تمناؤں کی تکمیل کے سلسلہ میں اسلامی کانفرنس تنظیم کو ایک پناہ گاہ مانتے ہیں۔

اسلامی کانفرنس تنظیم اپنے تیس سالہ تجربہ کی بدولت ایسے وسائل اور امکانات سے مالا مال ہو گئی ہے کہ اب وہ بین الاقوامی سطح پر ایک مئوثر کردار ادا کرے۔ پس یہ امر فطری ہے کہ اب مسائل کو نئے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے اور تنظیم کی ساخت کو مضبوط کرنے کے لئے ایسا طریقہ کار اپنایا جائے کہ اس کے فیصلے مؤثر اور ان پر عمل درآمد یقینی ہو جائے۔

موجودہ حالات میں اسلامی کانفرنس تنظیم کے لئے لازمی ہے کہ وہ بین الاقوامی طور پر اپنے وجود کو زیادہ متحرک اور نت نیا تجربہ کرنے والا بنائے۔ خاص طور سے وہ فیصلے جو ممبر ریاستوں کے جھگڑے اور اختلاف کے سلسلے میں ہیں یا وہ

پریشانیاں جو باہر سے ان پر تھوپ دی گئی ہیں، تنظیم کا وہ قدم جو اس نے بوسنیا کے قابل احترام عوام کے حقوق کی حمایت میں اٹھایا ہے اسکو تنظیم کی جانب سے بین الاقوامی مشکلات اور مسائل کے سلسلہ میں ایک اہم اور تبدیل شدہ نقطہ نظر کہا جا سکتا ہے۔ تحفظ اور تسلسل حساس اور فوری وشدید امداد مسلم معاشروں اور مسلم قوموں اور غیر عضو ملکوں میں اقلیتوں کے حقوق ومفادات کا خیال تعمیری نقطہ نظر سے مسائل اور خاص طور سے پرانے امراض کا علاج جیسے مسئلہ کشمیر ہے، تنظیم کو اس سلسلہ میں ادارہ کو مضبوط بنانے کے لئے زیادہ نمایاں کردار ادا کرنا چاہیئے۔

ہم سب کو اسلامی کانفرنس تنظیم کی مدد کرنی چاہیئے تاکہ وہ زیادہ زور اور دوٹوک طریقہ سے اسلامی دنیا کے اختلافات کا مخلصانہ اور ہمدردانہ حل تلاش کر سکے۔ ہمیں مالی اور سیاسی اعتبار سے تنظیم کی مدد بھی کرنی چاہیئے تاکہ وہ متفقہ فیصلوں پر عمل درآمد کر سکے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ تنظیم کو اسلامی دنیا کے بنیادی اور اہم مسائل اور مشکلات کی طرف پوری توجہ دینی چاہیئے۔ وہ اپنے فیصلوں کے دائرہ کو بڑھائے اور اپنی سرگرمیوں اور منصوبوں کو نئی توانائی بخشے۔ یقیناً اس سے تنظیم کو مزید طاقت اور توانائی حاصل ہوگی۔

آخر میں میں ایک مرتبہ پھر اپنے معزز مہمانوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور اسلامی کانفرنس تنظیم اور اس محترم مجلس کی مزید کامیابیوں کے لئے دعا گو ہوں الحمد للہ رب العالمین (شکر اس خدا کا جو عالموں کا پالن ہار ہے) اور ہماری آخری دعا بھی یہی ہے کہ اس خدا کا شکر جس نے تمام جہانوں کو پیدا کیا۔

والسلام علیکم ورحمتہ اللہ برکاتہ

چوتھا باب

گفتگو اور نیا ہزارہ

گفتگو اور نیا ہزارہ☆

میرے لئے بہت ہی خوشی اور مسرت کی بات ہے کہ میں آپ لوگوں سے یونیسکو (UNESCO) کے جلسہ میں آج کے اہم تہذیبی اور سیاسی مسائل پر خطاب کر رہا ہوں۔ آئندہ نسلوں پر اس مسئلہ کا بہت اثر پڑیگا ان کو برے اثرات سے نجات ملے گی اور اخلاقی، روحانی اور جمالیاتی طور پر تقویت حاصل ہوگی۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ مجوزہ تمدنوں اور تہذیبوں کے درمیان گفتگو اور مذاکرہ کے نتیجہ کے سلسلہ میں ضرورت سے زیادہ پرامید ہونا یا حوصلہ شکنی اور مایوسی دنیا کی موجودہ صورتحال کے پیش نظر قنوطیت اور یاسیت میں مبالغہ آرائی ہوگی لیکن اس تجویز کے سلسلہ میں جو رکاوٹیں ہیں ان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے ہمیں اس طول طویل، دشوار گذار اور خطرناک راستہ کا اندازہ ہونا چاہیئے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس تجویز کی عمل آوری کے امکانات کا شعور ہونا بھی ضروری ہے چونکہ انسانی زندگی کے مستقبل

☆ ۲۹/اکتوبر ۱۹۹۹ء کو اقوام متحدہ کی تعلیمی، سائینسی اور ثقافتی تنظیم کے سالانہ اجلاس سے صدر محمد خاتمی کے خطاب کا متن۔

پر اس کے مستقل سیاسی اثرات اور اس کے ذیل میں تاریخ ساز واقعات رونما ہونگے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تجویز کا بین الاقوامی حلقوں میں خصوصاً اقوام متحدہ جنرل اسمبلی ٹریبونل اجلاس میں خیر مقدم کیا گیا۔ اس تجویز کی اہمیت کے لئے کہ یہ کچھ کم نہیں کہ بات ساری دنیا کے عوام ہی نہیں اور دانشوروں نے بھی اس کا بھرپور استقبال کیا۔

ایسا نہیں ہے کہ دنیا والے ہر صدا پر لبیک کہنے کو تیار رہا کرتے ہیں۔ اس کو بہت سی مثالوں سے واضح کیا جا سکتا ہے۔ ماضی میں جب بھی فیاض اور خیر اندیش حضرات، کچھ مفکرین یا کچھ انقلابی لوگ دنیا کے کسی بھی گوشہ سے اپنے عہد و پیمان کی تجدید کے لئے یا پرانے انسانی خیالات کی جگہ پر نئے معاشرہ کو وجود میں لانے کیلئے اپنی آوازیں بلند کیا کرتے تھے۔ البتہ یہ انتہائی مخصوص موقع ہے کہ عالمی برادری نے تمدنوں کے درمیان گفتگو کی آواز پر لبیک کہا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس واقعہ کے اسباب کی تشریح اور توضیح میں سماجی اور سیاسی تسلیم شدہ عقیدہ یا موجودہ فلسفیانہ نظریہ قابل قبول نہیں ہے۔ اس تصور پر مبنی اور اس سوال کے جواب کی امید میں کہ تمام تمدنوں کے درمیان گفتگو کی تجویز کو سب سے پہلے اسلامی جمہوریہ ایران نے اقوام متحدہ جنرل اسمبلی کے ۵۳ ویں اجلاس میں کیوں پیش کیا اور اس کو ایسی غیر معمولی مقبولیت کیوں حاصل ہوئی؟ اس سوال کا جواب دینے کے لئے قومی مفاد اور سیاسی مصلحتوں کے بجائے انسانی ابلاغ و ترسیل کے بعض رائج اسباب و عوامل کی وضاحت لازمی معلوم ہوتی ہے اور ”تمدنوں کے

درمیان گفتگو' کے بنیادی تصور اور گفتگو کے حقیقی معنی ومفہوم پر اچھی خاصی بحث کی جا سکتی ہے۔

گفتگو کی لازمی تعریف پر کیا جانے والا مذاکرہ ومباحثہ ہمیں تاریخ اور فلسفہ کے دائرہ میں داخل کردیگا اور پھر ہمیں 'گفتگو' کے (Dialogue) فلسفیانہ پہلو اور لفظیات کو ایک دوسرے سے علحدہ کرنا پڑیگا۔ اس کے علاوہ اس سلسلہ میں اہل علم کی رائے پر بھی غور کرنا ہوگا۔ اگرچہ اس کے لئے یہ مناسب جگہ بھی نہیں اور نہ ہی اس کا وقت ہے لیکن ہم ڈائیلاگ سے متعلق کچھ اصطلاحات پر گفتگو کرنے کے لئے مجبور ہیں۔ یہ فرض کرتے ہوئے کہ فلسفیانہ اور نظریاتی طور پر اسکے معانی صاف ہیں لیکن یہ اصطلاح دونوں طرح سے استدلال اور استعمال کے طور پر مستعمل ہے۔ جب ہم دنیا کو ''ڈائیلاگ'' یعنی گفتگو کی دعوت دیتے ہیں تو وہ دونوں ہی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ پس وہ جلسے جو مختلف سوالات پر بحث کے لئے منعقد ہوتے ہیں وہ صحیح معنوں میں ڈائیلاگ کی مثال ہیں اور اسی طرح تمام تہذیبی، ہنر اور فنون لطیفہ کے تعلق سے، سائنسی اور ادبی سرگرمیاں ڈائیلاگ کا ہی ایک عملی رنگ و روپ ہیں۔ یہ تقسیم صرف ادبی یا صرفی نہیں ہے کیونکہ جب ہم نے ڈائیلاگ کے استدلالی مفہوم ومعنی کی چھان بین کی تو ہم ایک ایسے دائرہ میں داخل ہوئے جہاں استعمال کا طریقہ ناقابل عمل ہوجاتا ہے۔

یہ جملہ ''تمدنوں اور تہذیبوں کے درمیان گفتگو'' کچھ ایسی چیزوں پر مشتمل ہے جن میں ظاہری طور پر اختلاف بلکہ تضاد پایا جاتا ہے۔ 'گفتگو' اتنی ہی قدیم ہے جتنا

قدیم انسانی تہذیب وتمدن اور اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ ایک جدید اصطلاح بھی ہے۔ ایک مخصوص وقت میں رونما ہونے والے واقعہ کا بیان درحقیقت ڈائیلاگ کی صحیح تعریف ہوگی۔ اس اختلاف کو دور کرنا کچھ مشکل کام نہیں۔ اگر ہم اس جملہ کو سطحی طور پر لیں، مزید یہ کہ بیان واقعہ 'تمدنوں کے درمیان گفتگو' کے نقطہ نظر سے لیا جائے تو پھر تہذیب وتمدن اور انسان کی تعریف کرنی پڑیگی اور وہ بھی اس طرح کہ ڈائیلاگ کے جوہر سے نہ ٹکرائے۔ اسکا مطلب یہ ہوگا کہ انسان کے وجود کے اجتماعی پہلو پر زیادہ توجہ کرینگے، انسانی تمدن کے وسیع اور بے کراں صف کو خاص اہمیت دیں اور خاص طور سے اس پر زور دیا جائے کہ کوئی بھی بڑی تہذیب یا عظیم تمدن تنہائی میں نہیں پنپ سکا ہے۔ دوسرے لفظوں میں تہذیبوں اور تمدنوں کے صرف وہی ٹکڑے باقی رہ سکے ہیں جو ترسیل اور ابلاغ کی توانائی رکھتے تھے جن میں بات چیت کرنا اور سننا دونوں شامل ہیں۔ لہذا 'تمدن اور تہذیبوں کے درمیان گفتگو' میں بولنا اور سننا دونوں شامل ہیں۔ سننا ایک ایسی نعمت ہے جسکو بڑھانا چاہیئے اور یہ صفت ہر ایک میں آسانی سے پائی بھی نہیں جاتی ہے۔ اسکو حاصل کرنے کے لئے ایک سخت تربیت کا کورس کرنا پڑیگا جس کے لئے اسکو اپنی اخلاقی اور عقلی صلاحیت کو بڑھانا ہوگا۔ سننا ایک مجہول یا کمزور کام نہیں ہے۔ یہ ایک مئوثر اور زوردار مصروفیت ہے جس میں سننے والے کے سامنے ایک ایسی دنیا وجود میں آتی ہے یا کشف ہوتی ہے یا تحریر سے وجود میں آتی ہے۔ بولنے والا اسکو پیش کرتا ہے توجہ اور مستعدی سے سنے بغیر ڈائیلاگ کا مقصد ہی فوت ہوجاتا ہے۔

جملہ 'تمدنوں کے درمیان گفتگو' کے معنی و مفہوم کو ایک نسخہ کی حیثیت سے سمجھنے کیلئے سوائے اسکے کوئی دوسرا چارہ نہیں ہے کہ مختلف نکتوں کو اچھی طرح سمجھا جائے۔ ان اہم نکتوں میں سے ایک بات یہ ہے کہ ایک فنکار اور سیاستداں کے درمیان موجودہ تعلقات اور دوسری طرف سیاست اور اخلاقیات کے درمیان موجودہ روابط کو بخوبی سمجھا جائے۔ یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ ایک بڑے سیاست داں اور ایک ماہر فنکار کے درمیان تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟ دونوں کے درمیان اختلاف ظاہر ہے کیونکہ وہ دونوں دو مختلف انسانی میدانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ کون سے میدان ہیں جس میں وہ ایک ساتھ ہیں اور کس پہلو سے ان کے درمیان مقابلہ کیا جا سکتا ہے؟ اگر ہم سیدھے سادھے معنی دیکھیں جو سیاست کی وضاحت کرتے ہیں۔ سیاسی تعلقات میں بعض ڈپلومیٹک مشقوں کی موجودگی خود بخود ایک ہنر ہے۔ پھر ہم کہہ سکتے ہیں ایک سیاست داں اور فنکار کے درمیان موجود بہت گہرا تعلق ہے۔ اگرچہ فنون لطیفہ کے اعتبار سے فلسفہ کی تعریف کئی طرح سے کی جاسکتی ہے اور ہم کو کسی ایک کو اختیار کرنے کی آزادی ہے لیکن ہم یہ حقیقت بھلا نہیں سکتے ہیں کہ ایک فنکار ایسا شخص ہے جو موجودہ زمانہ میں رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور وہ اپنے موجودہ کو ایک ابدی زمانہ میں بدل سکتا ہے۔ اس ابدیت کو موجودہ سے بدلتے ہیں اور وقت کا تصور پیش کرنے کی خاطر کب ''اور کس موقعہ پر'' فنکار ایک فن کا نمونہ تخلیق کرسکتا ہے اور ہم سامع اور ناظر کی حیثیت اس کے مسحور تماشائی بن جایا کرتے ہیں۔ یہی وہ کام ہے جو ایک فنکار کا جادوئی کمال ہوتا ہے اور صرف بڑے فنکار ہی یہ مقام حاصل کرنے کے

قابل ہوتے ہیں۔اس مرحلہ میں ایک فن پارے کی تاریخی قسمت ''دوام'' سے رنگ دی جاتی ہے۔ہم اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ قوموں کی تاریخی قسمت کا ڈھانچہ بڑے سیاستداں کسی خاص موقع پر تیار کرتے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ یہ الفاظ آپ کو کوئی پرانا اختلاف یاد نہیں دلائینگے جیسے تاریخ پر شخصیتوں کے اثر کے بارے میں طرح طرح کے مباحثے ہوتے رہے ہیں کیونکہ سردست میں اس سلسلہ میں کسی طرح کا بھی مباحثہ کرنے کی نیت نہیں رکھتا۔ہم صرف تاریخ میں بڑی شخصیتوں کے کردار کے بارے میں ہی سوال کر سکتے ہیں۔کسی شخصیت کے وجود کو اور اس کے انفرادی پہلوؤں کو اجتماعی پہلوؤں سے جدا کر سکتے ہیں۔اب ہم جانتے ہیں کہ اس طرح کا فیصلہ یکطرفہ ہوگا چاہے کوئی بھی کرے۔

لہذا مذکورہ نکتہ نظر کی بنیاد پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سیاسی ماہروں اور فنکاروں کے درمیان تخلیق کے علاوہ کوئی دوسری چیز مشترکہ صفت کا درجہ نہیں رکھتی ہے۔جب تخلیق آجاتی ہے تو تکرار یا نقالی بالکل بے معنی ہو جاتی ہے مزید برآں تخلیق کا پورا اظہار کسی بھی شخص میں اسکی مضبوتی پر ہے۔

ایک بڑا فنکار فنی حقیقت کو تخلیق اور مضبوتی سے حل کرتا ہے اور ایک بڑا سیاستداں اسی کی طرح اپنے ملک کے بنیادی اور بڑے مسائل کو اسی مضبوطی، اٹل ارادہ اور خلاقیت سے حل کرتا ہے۔

آج سیاستداں ایک روشن مستقبل کو وجود میں لانے کے لئے لمبے قدم اٹھا سکتا ہے۔ایسا مستقبل جو مبنی بر انصاف، زیادہ انسانی اور زیادہ ہی حسین ہو۔ ''تمدنوں کے

درمیان گفتگو، کی تجویز کو بروئے کار لاکر فقط اپنے ملکوں کے لئے ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کے لئے ایک روشن مستقبل کی تعمیر وتشکیل کا کام انجام دے سکتے ہیں۔

ایک اور نقطہ جو میں یہاں بیان کرنا چاہوں گا جس کا سیاست اور اخلاق کے درمیان تعلقات اور وہ تہذیبوں کے درمیان گفتگو سے گہرا رشتہ ہے اخلاق اور سیاست کے درمیان تعلقات کے سلسلہ میں نظریاتی اعتبار سے کافی کہا جاچکا ہے۔ لیکن جو چیز ہمارے لئے باعث تشویش ہے وہ یہ کہ تمدنوں کے درمیان گفتگو کی تجویز کے اخلاقی پہلو کی طرف زیادہ توجہ کی گئی ہے۔ اس تجویز کو بروئے کار لانے کے لئے سیاسی اخلاق میں ایک بنیادی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ عاجزی، مصمّم ارادہ اور مقصد سے مکمل وابستگی یہ تین اہم اخلاقی ضروریات ہیں جن کے ذریعہ سے سیاست کے میدان اور بین الاقوامی تعلقات کے میدان میں اس تجویز کو پسندیدگی و مقبولیت حاصل ہوسکتی ہے۔

تمدنوں کے درمیان ثقافتی گفتگو کے سلسلہ میں ایک اور اہم نقطہ نظر یہ ہے کہ ''ڈائیلاگ'' کی اصطلاح یہاں پر بہت ہی محدود اور تنگ معنوں میں استعمال ہوئی ہے۔ یہاں یہ اس تصور سے بالکل مختلف ہے جس کا مطلب ثقافتی تعلقات، ثقافتی باہمی متبادلات اور ثقافتی غلبہ سے ہے۔ اسمیں بہت سے اسباب عوامل کارفرما ہوتے ہیں جیسے جنگ جو ثقافتی اور سائنسی تعاون کی ایجاد کرتی ہے یا جس کے نتیجے میں ایک تہذیب کو دوسری تہذیب پر غلبہ کا سبب جارحیت ہوتی ہے۔ لیکن ہمارے عہد میں وہ اطلاعات کی ٹیکنولوجی کی مدد سے ہوتا ہے۔

لیکن یہ گفتگو کسی ایک موقع ومحل اور مخصوص نفسیاتی ،فلسفیانہ اور اخلاقی حالات میں بھی ممکن ہے۔ خاص نقطہ نظر اور عقیدہ کا حامل سیاسی ، اخلاقی مذہبی اور خاص فلسفیانہ نظام میں یقین رکھنے والا۔ کوئی بھی آدمی دعویٰ نہیں کرسکتا کہ وہ ''گفتگو'' کی حمایت کرتا ہے۔ایک سچے اور حقیقی ڈائیلاگ یا گفتگو کے لئے علوم متفرقہ کے بارے میں اطلاعات کا وجود لازمی ہے جس کے بغیر کوئی بھی ڈائیلاگ اپنے حقیقی معنی و مفہوم کے اعتبار سے ممکن ہی نہیں ہے۔ اسلئے دنیا کی تنظیموں جیسے یونیسکو (UNESCO) کے لئے ضروری ہے کہ وہ علوم متفرقہ پر تحقیقی کام کرائے۔ اور عالمی برادری کے لئے علوم کو مقبول پسندید بنا کر ان کی اشاعت کا اہتمام کرے۔

یہ علوم اور تمدنوں کے درمیان گفتگو کی اصل تجویز جدیدیت اور مثبت پسندی کے عقیدہ کا نام نہیں اور نہ ہی وہ شدید فراریت جو جدیدیت کے مابعد سے میل کھاتی ہے۔لہذا تمدنوں اور تہذیبوں کے درمیان گفتگو جیسے نظریہ اور تجویز کی وکالت کرنے والوں کا فرض ہے کہ وہ اس نظریہ کی فلسفیانہ اور عالمانہ حقیقت کو کسی طرح کی آمنیرش سے پاک رکھیں اور آئندہ بھی پاک صاف رکھنے کی کوشش کرتے رہیں۔ اسطرح کے پاک صاف کرنے کا عمل کسی بھی نظریہ کو عقائد کے مخالفانہ نظریہ سے باہر نکال لاتا ہے اور سچ کی تلاش کرتا ہے۔ اور مابعد جدیدیت کے مفکرین میں پائی جانے والی غیر معمولی شدت پسندی کی بنیادی وجہ یہ ہے یہ لوگ دنیا کے ان ہزاروں لوگوں کی درد بھری آواز کی طرف ہرگز متوجہ نہیں ہیں جو ظلم سے نجات اور حق وانصاف کی تشکیل کے خواہاں ہیں اور ان لوگوں کی بے توجہی کی کوئی فلسفیانہ معقولیت یا وضاحت موجود

نہیں ہے۔

تمدنوں کے درمیان گفتگو کے سلسلہ کی ایک اور ابتدائی شرط صبر وتحمل ہے۔ اگرچہ صبر وتحمل ایک ایسی ضرورت ہے جس کا گفتگو کے ابتدائی مرحلہ میں ہی ہونا لازمی ہے لیکن ہمیں نہایت ہوشیاری کے ساتھ منفی تحمل اور مثبت تعاون کے درمیان فرق کرنا ہوگا کیونکہ اول الذکر منفی تحمل ایک جدید تصور ہے اور آخر الذکر یعنی مثبت تعاون مشرقی مذاہب اور فلسفوں کی تجویز کردہ ہے۔ کہ وہ اپنے موجودہ منفی صبر سے مثبت عوامی تعاون کی سطح تک پہنچ سکے۔ کوئی بھی مسلمان جو قرآن سے آشنا ہے اسکو وہ آسمانی صدا یاد آتی ہے جس میں عوام کو انسانی سرگرمیوں کے سلسلے میں کثرت وشدت کی دعوت دی گئی ہے جیسے ہی وہ تعاون کا لفظ سنتا ہے اس کو وہ قرآنی آیت یاد آجاتی ہے جس میں رحم اور نیکی میں تعاون پر زور دیا گیا اور یہ کہا گیا کہ سبھی انسانوں کا تمام سرگرمیوں میں شرکت کرنا لازمی ہے۔ یہی وہ گرانقدر صفات ہیں جو تیسرے ہزارہ میں دین کو نیا روپ دینے والی ہیں۔ کوئی بھی قوم اپنے فلسفیانہ سیاسی یا اقتصادی دلیل کی بنا پر اس سے الگ نہ رہے۔ صرف یہ کافی نہیں ہے کہ دوسروں کو برداشت کیا جائے بلکہ اہم بات یہ ہے کہ دوسروں کے ساتھ مل کر کام کیا جائے۔ تمام انسانوں کی شرکت سے انسانوں کی دنیا کا نقشہ بدلا جاسکتا ہے۔ اگرچہ بیسویں صدی کے آغاز تک یہ ایک انسانی کہاوت ہی لگتی تھی لیکن آج یہ انسانی زندگی کے دوام اور تسلسل کے لئے ایک ضرورت بن گئی ہے۔

یہ تعاون صرف اقتصادی اور سیاسی سطح کا نہیں ہے بلکہ لوگوں کے دلوں کو قریب

تر کرنے کے لئے ہمیں نئے راستے تلاش کرنے چاہیے کہ کیسے لوگوں کے درمیان موجود ذہنی خلیج کو پاٹا جائے۔ کوئی بھی شخص اس صورت حال میں دلوں کے ملانے کے عمل میں زیادہ پر امید نہیں ہوسکتا جب تک اسکے ذہن میں مذہبی فلسفیانہ اور اخلاقی بنیادوں میں ٹکراؤ موجود ہے۔ دلوں کو نزدیک لانے کے لئے ذہنوں کو نزدیک لانا ضروری ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک دنیا کے بڑے مفکرین دوسروں کے افکار اور تصورات کو سمجھنے کی خصوصی کوشش نہ کریں اور پھر انہیں اپنے لوگوں تک نہ پہنچائیں۔ یہ ضروری ہے کہ بنیادی تصورات کے بارے میں جو دل اور دماغ سے متعلق ہیں بات کی جائے اور ہر آدمی اس سلسلے میں اظہار خیال کرے کہ وہ زندگی کا کیا مطلب سمجھتا ہے؟ خوشی اور مسرت کے معنی کیا ہیں؟ اور مزے سے کیا مراد ہے؟ اس کا کوئی فوری نتیجہ تو نہیں ہوگا لیکن اسکے بغیر کوئی بھی اقتصادی اور سیاسی اتحاد اتفاق کا نتیجہ عارضی اور سرد نکلے گا۔ بیسویں صدی جو تاریخ میں اپنے مظالم اور جنگوں اور بے شمار ظلم اور زیادتیوں کی مثالوں کے لئے یاد رکھی جائیگی لیکن اسی کے ساتھ ساتھ بہت سے نئے فلسفیانہ تصورات اور سیاستدانوں کے عاقلانہ اقدام کے لئے بھی یاد کی جائیگی کیونکہ اس صدی میں رونما ہونے والے خونیں اور دہشت آلود واقعات بغیر کسی سیاسی فکر میں تبدیلی کے اور بغیر بین الاقوامی تعلق کو تبدیل کئے ہوئے اور تمدنوں اور تہذیبوں کے درمیان گفتگو کی قدیم روایت کو نئی مثال سے بدلے بغیر ان حوادث کا واقع ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔

مذہبی عقیدہ آسمانی صدا کا مثبت جواب اور انسان کے قلب کی گہرائیوں سے

نکلی ہوئی آواز اسکو نا قابل تغیر اور غیر متحرک چیز نہ سمجھنا چاہیے۔ مذہب کے سلسلہ میں ہماری فہم میں تبدیلی و تفسیر کو عقیدہ کی روح سے نہیں ملانا چاہے۔ کیونکہ اسطرح کا عدم توازن مذہبوں کے درمیان گفتگو میں ایک رکاوٹ بن جائیگا جبکہ توازن ایک دیرپا امن کے حصول کے لئے پہلی سیڑھی ہے۔ جیسے ہم اپنے روزمرہ کی روٹی اور پانی زمین سے حاصل کرتے ہیں اسی طرح سے روزمرہ کا تازہ اور زندہ عقیدہ کا حصہ آسمان سے حاصل کرنا چاہے۔ عقیدہ ایک بہتے ہوئے دریا کی طرح سے ہے اور اسمیں جمود کی دلدل کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ عقیدہ جب مسلسل آگے بڑھ رہا ہو تو اس سے اخلاقیات اور امن کا ثمرہ حاصل ہوتا ہے۔ یہ ہمیشہ بہتے ہوئے عقیدہ کا ہنر ہے جس کی وجہ سے انسان دنیا سے اور اپنے ساتھی انسانوں سے محبت کرتا ہے۔

دو دوسری اہم بات یہ ہے کہ جس صلح کا گفتگو سے تعلق ہے وہ ایک مخصوص قسم کی صلح ہے جسکو نام نہاد۔ Pax Romana یعنی ''وست پسندانہ صلح کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے اور اس صلح کو حاصل کرنے کے لئے طاقت اور قانون جیسے ضامنوں کی ضرورت پڑی ہے اور طاقت کے بغیر اس کا برقرار رکھنا ناممکن ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صلح کسی کے کام آنے والی نہیں ہے جبکہ گفتگو کے ذریعہ حاصل کی گئی صلح انسان کی بلوغیت کی دلیل ہے وہ خود بخود وجود میں آتی ہے اور اسکے ذریعہ ہی انسان کو منطقی اور نفسیاتی ترقی حاصل ہوتی ہے۔ عاقلانہ ترقی میں پیچھے کی طرف لوٹنا تقریباً ناممکن ہے اس طرح کی صلح یقیناً دیرپا اور دوررس ہوا کرتی ہے جس کی وجہ سے تہذیبوں کے درمیان صلح، مذہبوں کے درمیان صلح، تمدنوں کے درمیان صلح اور انسان اور فطرت

کے درمیان صلح حاصل ہوتی ہے۔

آج انسان اور فطرت کے درمیان دیرپا امن کو اولین ترجیح دینی چاہیئے۔ انسان اور فطرت کے درمیان پرانے تعلق جس میں انسان فطرت سے محبت کرتا تھا' اسکی برکتوں سے فائدہ اٹھاتا تھا اور اس کی قربت میں پناہ لیتا تھا آج وہ سب فطرت کو آلودہ وخراب کرنے اور اسکو برباد کرنے میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ ہزاروں سال کی مدت ما قبل تاریخ سے جدید زمانہ تک ہزاروں سال کی مدت گزر گئی لیکن اس طویل مدت کے دوران انسان نے فطرت کو صرف طاقت کا منبع نہیں سمجھا۔ اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان نے زمین اور اسکے ثمرات سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ وہ اپنی سماجی اور شہری زندگی کو ترقی دینے کے عمل میں بھی مصروف نہیں رہا اور یا اپنے اردگرد کے فطری ماحول معمولی تبدیلیاں نہیں کرتا رہا ہے۔ اس نے اپنے آپ کو فطرت کے مطابق ڈھالنے میں اور فطرت کو اپنی ضرورت کے مطابق ڈھالنے کا عمل جاری رکھا ہے۔ یقیناً وہ یہ سب کچھ کرتا رہا ہے لیکن کبھی بھی فطرت کو ''صرف ایک شئے'' کے طور پر نہیں سمجھا۔

تمام تہذیبوں اور روایتوں میں اور تمام ہی نژادی گروہوں میں اور دنیا کے اقوام میں بہت سارے پرانے ایسے رسم ورواج موجود تھے جنکو مختلف اوقات میں اور مختلف جگھوں پر عمل میں لایا جاتا تھا جنکا تعلق فطرت کے واقعات سے تھا۔ لیکن جس چیز کو آج کے زمانہ میں ''لاتعلقی'' کہا جاتا ہے اس نے نہ صرف یہ کہ پرانے رواجوں کو بدل دیا بلکہ فطرت سے انسانی تعلقات کو بھی بدل دیا۔ اس نے ایک ایسی صورت حال

پیدا کردی ہے جس میں انسان دنیا اور اس میں جو کچھ ہے اسکو با معنی مفید اور مکمل نہیں سمجھتا کیونکہ انسان فطرت سے وابستہ نہیں رہا ہے۔ سمندر پہاڑ، جنگل اور صحرا اب اس کے لئے صرف ماوی ضرورت کی تکمیل کی خاطر مختلف صورتوں میں موجود ہے۔ فطرت سے انسانوں کے قریبی اور گہرے تعلقات کو بھی کمزور کر دیا ہے، تمدنوں اور تہذیبوں کے درمیان گفتگو کیلئے سب سے اہم اور فوری مسئلہ یہی ہے جس سے ساری انسانیت متاثر ہو رہی ہے اور قدرتی طور پر اس کو اپنے ایجنڈے میں سرفہرست رکھنا چاہیئے۔ فطرت سے انسان کا تعلق تمدنوں اور تہذیبوں میں گفتگو کی فہم قدرتی طور پر آج کے دور میں ایک دلچسپ مباحثہ میں پہنچا دے گی جسکا موضوع بین الاقوامی مسائل ہوگا۔ آج کا انسان انصاف امن اور آزادی اور سلامتی کی تلاش میں سرگرداں ہے اور ان گرانقدر قدروں کو وہ ہمیشہ ہی تلاش کرتا رہا ہے۔ تمدنوں کے درمیان گفتگو کے ذریعہ جو امن کا حصول لازمی ہے اور اگر یہ ایک دفعہ حاصل ہوگیا تو یقیناً دیرپا بھی ہوگا۔

ہم جس گفتگو کو امن و سلامتی کی بنیادی اور لازمی ضرورت قرار دیتے ہیں اس سے ہماری مراد وہ گفتگو ہے جو سفارتی معاہدوں اور سمجھوتوں سے جدا ہو۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ تاریخ میں ایسے بہت سے مواقع آئے ہیں جب جنگ اور صلح ایک دوسرے کے ساتھ موجود رہے ہیں۔ گفتگو سے ہماری مراد ڈپلومیٹک زبان میں اپنے سیاسی اور اقتصادی مفاد کو بڑھانا دشمن پر کامیابی حاصل کرنا اور مختصراً یہ کہ جنگ کو ایک دوسری شکل میں جاری رکھنا نہیں ہے۔ تمدنوں کے درمیان گفتگو ہمدردی اور مہربانی اور باہمی مفاہمت کے بغیر ممکن نہیں ہے اور اس میں دوسروں کی نابودی کا خیال

آنا بھی غلط ہے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ تمدنوں اور تہذیبوں کے درمیان گفتگو دنیا میں بدنظمی اور اتھل پتھل پیدا کر دیگی اور اس امکان سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن ابتدائی مرحلہ میں ہی اس تیزی اور رفتار کو گھٹایا جا سکتا ہے جس سے اس حادثہ کے ہونے کا امکان ہے اور یہ مقصد مناسب تعلیم اور تربیت کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ہمیں وہ عدم کارکردگی کو بھی ذہن میں رکھنا چاہئیے خواہ اسکو پسند کریں یا ناپسند کیونکہ وہ انسانی وجود کے سلسلہ میں ایک ناگزیر مسئلہ ہے۔ موت اور ثقافتی انتشار و نابودی کے مقابلے میں زندگی اور ثقافتی ثبات قدم بہر حال بہتر انتخاب ہے۔

جنگ اور جھگڑوں کی حقیقت کا گہرائی سے مطالعہ کئے بغیر تمدنوں کے درمیان گفتگو کا نظریہ آگے نہیں بڑھ سکتا ہے۔ اس طرح کے اختلافات اور جھگڑوں کا مطالعہ دنیا کی موجودہ صورتحال کو نگاہ میں رکھے بغیر بالکل الگ کر کے نہیں کیا جا سکتا جنگیں اکثر نفسیاتی حقیقت کے سبب ہوتی ہیں اور سماجی نفسیات کے ماہرین اور نفسیات کے تجزیہ دان ایک زمانہ سے اس کے مطالعہ میں مصروف ہیں۔ وہ سیاسی اور اقتصادی عوامل کی وجہ سے بھی ٹوٹ گئے ہیں۔ غریب اور امیر ملکوں اور افراد کے بیچ خوفناک خندق کی موجودگی میں ہم امن اور باہمی فہم اور ادراک کی بات کیسے کر سکتے ہیں۔ عالمی سطح پر افراد اور ممالک کے درمیان موجود عدم مساوات اور نابرداری کا بول بالا ہے اور دنیا کے کمزور اور پس ماندہ لوگوں کی ترقی کیلئے کوئی تعاونی قدم نہیں اٹھایا جا رہا ہے ظاہر ہے ایسے حالات میں ہم ان سے ''گفتگو'' کا مطالبہ کیسے کر سکتے ہیں۔ جبکہ

تیسرے ہزارہ کے موقع پر دنیا کی آبادی کی ۳۰ فیصدی بہت ہی غربت میں زندگی گزار رہی ہو۔ ہم انصاف کو بھلا کر امن اور سلامتی کی بات کیسے کر سکتے ہیں؟ اگر مغرب اپنی زندگی اور معاشرت کو بچانا چاہے اور دنیا کے دوسرے حصہ کے لوگوں کی قسمت کو بھول جانا چاہے، تو بھی یہ کام ممکن نہیں ہے کیونکہ اپنی سلامتی کو بچانے کی خاطر دوسروں کی مدد کرنی چاہیئے اور بہت سی سماجی سیاسی اور ٹیکنیکل وجوہات کیوجہ سے آج کی دنیا کے سبھی لوگ ایک ہی جہاز پر سوار ہیں۔ طوفانوں کا منہ موڑنے اور ساحل پر سلامتی کے ساتھ پہنچنے میں یا تو سب کامیاب ہونگے یا کوئی بھی نہیں۔ آج یہ بیان کچھ مبالغہ آمیز لگے گا لیکن کل اسکا سمجھنا آسان ہوگا۔ تیسرے ہزارہ کے آغاز میں ہماری دنیا مشترکہ قسمت کی حامل ہے۔ یہ قسمت انصاف اور خوشی اور مسرت پر مبنی ہے اور اسکے لئے واحد راستہ تمدنوں اور مختلف تہذیبوں کے درمیان گفتگو ہے۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ بیسویں صدی میں تلوار نیام سے باہر رہی تو کچھ کو کامیابی حاصل ہوئی اور کچھ کو ناکامی۔ لیکن اگلی صدی کو گفتگو کے ارد گرد گھومنا چاہیئے۔ وگرنہ یہ تلوار دو دھاری بن کر سب کو ختم کر دیگی اور یہ بھی ممکن ہے کہ طاقتور لڑاکو ہی اسکا سب سے پہلا شکار ہوں۔

☆☆☆

پانچواں باب

تعقل پسندی اور مذہب

تعقل پسندی اور مذہب

موجودہ زمانہ میں مذہب کا مقام و مرتبہ، اپنی قسمت سازی میں لوگوں کا بنیادی کردار، مذہب اور جدت پسندی و جدیدیت کے مابین تعلقات، آزادی کے سلسلے میں مذہبی حکومتوں کا رویہ اور اسی کے ساتھ ساتھ مذہب اور جمہوریت کے درمیان تعلقات جیسے اہم مسائل مرکزی حیثیت حامل ہیں۔ اگر ہم ان کی طرف توجہ نہیں کرتے تو یہ شاید ہم ہونگے جو منظر سے غائب ہونگے وہی آدمی اپنے زمانہ میں زندگی بسر کرتا ہے عصری آگہی سے مالا مال اور آج کی دنیا کو خوب سمجھتا ہے اور موجودہ مسائل کے سلسلے میں نئے نئے حل تلاش کرتا ہے۔ اگر ہم وجود کے اعتبار سے آج کے زمانہ میں موجود ہیں لیکن فکر کے اعتبار سے غیر حاضر تو پھر ہم اپنے زمانے میں موجود ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ آج انقلاب دوست اور مخلص یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ہمارا انقلاب زندگی کے سلسلے کیا نمونہ پیش کرتا ہے اور ہمارے دشمنوں کی خواہش ہے کہ یہ انقلاب منظر سے محو اور ناکام ہو جائے۔ پس یہ اہم مسائل ہیں جنکا اس زمانہ میں سامنا ہے اور جن کی طرف فوری توجہ کی ضرورت ہے۔

تین عظیم تاریخی شخصیتیں یعنی امام خمینی شہید مطہری اور شہید صدر نے ہماری موجودہ تاریخ میں اہم کردار ادا کرتے ہوئے اور عصری فکر کی تشکیل میں حصہ بھی لیا

ہے خاص طور سے مسلمانوں کی نئی نسلوں کی تعمیر میں ان کی خدمات نا قابل فراموش ہیں۔ انکی زبردست کامیابی اس میں تھی کی انہوں نے مسلم دنیا اور خاص طور سے شیعہ دنیا کو تہذیبی اعتبار سے بدل دیا۔ امام خمینی جو نئی فکر اور نئی تہذیب کو جوڑنے والے تھے وہ اس عظیم تاریخی تبدیلی کا منبع اور مبداء ثابت ہوئے۔ یہ تینوں حضرات اپنے علم اور تجربہ میں لاثانی اور غیر معمولی تھے۔ اور کوئی مفکر اور محقق انکی دور اندیشی کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔ جن لوگوں نے باقاعدہ مذہبی تربیت نہیں حاصل کی ہے، عملی امور میں عالم دین کی ھدایت ان کے لئے لازمی ہوا کرتی ہے، صاحبان عقل وفکر کسی کی اندھی تقلید نہیں کرسکتے ہیں چاہے وہ غیر معصوم مذہبی رہنما کتنا ہی بڑا عالم دین کیوں نہ ہو۔ اسی وجہ سے میرا یہ عقیدہ ہے کہ عظیم شخصیتیں جیسے مطہری اور صدر مذہب اور علم و دانش کے معاملہ میں حرف آخر نہ تھے۔

اہم اور قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ ان حضرات کو اولیت حاصل تھی جنہوں نے پہلا قدم پورے یقین کے ساتھ اٹھایا اور ہمارے لئے ایک نمونہ ثابت ہوئے۔ فی الحقیقت یہ لوگ بہت زیادہ احترام اور عزت کے مستحق ہیں لیکن ان کے خیالات پر تنقیدی نظر ڈالی جانی چاہیئے۔ کیا مطہری اور صدر نے ہمارے معاشرے کو نئی فکر دی اور نیا رجحان دیا ہے؟ میرا عقیدہ ہے کہ ان حضرات کی آمد سے قبل اس نئی فکر نے ہمارے معاشرے کو بدلنا شروع کر دیا تھا، اس سے قبل جب ہمارا مقابلہ مغرب سے شروع ہوا اسوقت ہمارے کچھ سخت روایت پرست لوگوں نے مغرب کو بالکل نظر انداز کر دیا جبکہ کچھ مغرب زدہ دانشوروں نے بنیادی طور پر مغربی افکار کو اپنا لیا۔ مذہبی فکر کے سُنی اور

شیعہ فرقوں کے مصلحین جیسے سید جما الدین اسد آبادی، شیخ محمد عبدہ، اقبال لاہوری، علامہ نائینی اور عظیم شخصیتیں جیسے مطہری، شریعتی اور صدر جو نہ تو مغرب میں ضم ہونے کے قائل تھے اور نہ ہی پورے طور پر اس کو رد کرنا چاہتے تھے اس کی جگہ انہوں نے ایک صحت مندانہ درمیانی راستہ اختیار کیا۔ اسد آبدی کی کتاب بطور مثال پیش کی جاسکتی ہے جس میں انہوں نے مادہ پرستی پر سخت تنقید کی ہے۔ اس کتاب نے اس سلسلہ میں ایک لمبی بحث چھیڑ دی۔ شہید مطہری اور صدر کے زمانہ سے پہلے علامہ طباطبائی نے ایران میں اور بہت سارے دوسرے مسلم مفکرین نے ان سوالوں کا جواب پانے کی کوشش کی تھی۔ مطہری اور صدر کو غیر معمولی حیثیت اس اعتبار سے بھی حاصل ہے کہ انھوں نے مادیت پرستی اور اشتراکیت کے مقابلے میں اسلامی فکر کا دفاع کرتے ہوئے ایک نئی فکر کو رواج دیا جو عمیق مطالعہ کی بنیاد پر مبنی ہے۔ یہ موضوع ان تمام دانشوروں اور مذہبی لوگوں کی توجہ کا طالب ہے جو مذہب اور جدید روشن فکری کے بارے میں سوچتے ہیں۔

مغرب کی خرابیوں اور خامیوں کے سلسلے میں مزید غور و فکر اور تفتیش کی ضرورت ہے۔ ہماری مذہبی افکار اور مغرب کی اقدار میں خاصہ فرق موجود ہے۔ ہماری فکر کی اساس خدا کے حاضر و ناظر اور علیم و خبیر ہونے کی بنیاد پر ہے جبکہ مغرب اس طرح کے کسی وجود کا سرے سے انکار کرتا ہے اور کم از کم سماجی اور معاشرتی معاملات کو چلانے کے دائرے میں اس طرح کے وجود کا قائل نہیں۔ یہ ایک بہت بڑا فرق ہے کہ روحانی معاملات میں ہمارے مقابلے میں مغرب کو کم قوت حاصل ہے۔

موجودہ دور میں اقتصادی، تکنیکی اور سائنسی قوتوں پر مغرب کا قبضہ ہے۔ جبکہ مسلمان ان میدانوں میں بہت پیچھے ہیں۔ ہمارا قرآن تجویز کرتا ہے کہ ان کے مقابلہ میں قوت حاصل کرو اپنی پوری توانائی کے ساتھ (قرآن ۶۰۔۹) دراصل قرآن ہمیں مشورہ دے رہا ہے کہ ہم توانائی کے سبھی مساوی ذریعوں کو حاصل کریں تاکہ ہم اپنی قوت کے بل پر بعد میں اپنے حقوق کا دفاع کرسکیں۔ میں یہاں پر اس رہنمائی کی بنیاد سے اختلاف کرتا ہوں کیونکہ تمدن کو میں ایک بنیاد مانتا ہوں میں تمدن کو نہ رہنما مانتا ہوں اور نہ روشنی۔ تمدن خاص عقائد کی ضرورتوں اور لوگوں کے اندیشوں پر مبنی ہے اور جیسے جیسے لوگوں کے عقائد بدلتے ہیں ویسے تمدن میں تبدیلی آتی جاتی ہے۔ حضرت محمد ﷺ کے بعد تیسری اور چوتھی صدی ھجری میں (آٹھویں اور نویں صدی عیسوی میں) مسلمان اسلامی تعلیمات کی بنیاد پر اور قرآن اور جو کچھ انہوں نے ایرانی اور یونانی تمدنوں سے حاصل کیا تھا اس کی بنیاد پر ایک نیا تمدن وجود میں لائے اگر چہ اسلامی تمدن کا سنہری دور ختم ہوگیا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ قرآن اور اسلام بے ربط ہو گئے ہیں۔ ہم مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ ہم قرآن اور صحیح اور معتبر اسلام پر ایمان رکھیں اور اپنی مذہبی بنیادوں پر آج کے مسائل کا حل تلاش کریں۔ مغربی تمدن کے اثرات سب جگہ ہیں لیکن میرا عقیدہ ہے کہ یہ تمدن بھی ابدی اور آخری نہیں ہے کیونکہ یہ انسانوں کا بنایا ہوا ہے۔

تمام انسانی کامیابیوں کو نئی نسلیں کام میں لائیں جیسے کہ مغربی دنیا نے اسلامی دنیا سے بہت کچھ حاصل کیا ہے بالخصوص اس سنہری زمانے میں جب اسلامی دنیا نے

فارسی اور یونانی تہذیب سے اپنے آپ کو مالا مال کر رکھا تھا۔ ہمارا بنیادی سوال یہی ہے کہ ہم مسلمان اب کیا کریں جبکہ مغربی تمدن حاوی ہے اور ہم نے اپنا پرانا تمدن اپنے ہاتھ سے کھو دیا ہے۔ اگر ہم آج کی دنیا میں اس سلسلے میں عملی کردار ادا کرنا چاہتے ہیں تو کیا ہم مغرب کے ماضی کی طرف لوٹیں؟ وہ تو بازگشت ہوگی۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا ہم مغربی تمدن پر سبقت حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ یا ہم مغرب میں تحلیل ہونا چاہتے ہیں؟

شدید روایت پرست چاہتے ہیں کہ ہم اپنے ماضی کی طرف لوٹیں۔ مغرب زدہ چاہتے ہیں کہ ہم مغرب کی جانب جھکیں۔ لیکن وہ لوگ جو اپنے مذہبی اور قومی تہذیب کے بارے میں فکر مند ہیں، انکا عقیدہ ہے کہ ہم مغربی تمدن سے قربت و شرکت کا رویہ اس لئے اختیار کریں کہ اس پر سبقت حاصل کی جا سکے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اپنے مذہبی منابع کے بارے میں باخبر رہنا اور آج کی دنیا کے مسائل اور پیچیدگیوں سے مکمل واقفیت بھی لازمی ہے۔ ہم مغرب کی سب مثبت کامیابیوں کو اپنائیں اور پھر اس کے مقابلہ میں اپنے وارث کو دیکھیں تاکہ اس کی کمیوں کو دور کیا جا سکے۔ اس وجہ سے ہم اپنی پوری توجہ مغرب کے مستقبل پر رکھیں نہ کہ اسکے ماضی پر۔

تمام مذاہب اور خاص طور سے اسلام کا ایک اہم ستون ایمان ہے اور اس اصطلاح کی تعبیر کے لئے ہمیں ایک خاص ضرورت ہے۔ بدقسمتی سے ایمان کو اسلامی تاریخ میں فرد کے دائرہ تک محدود کر دیا گیا ہے کیونکہ شیعہ عقائد کے لوگوں نے صحیح معنوں میں کبھی بھی سماج پر حکومت نہیں کی۔ اور یہ بات برادران اہل سنت پر بھی

صادق آتی ہے۔ حکومت صرف طاقتور لوگوں کی رہی جبکہ عوام الناس کو اختیار اور قدرت کی باگ ڈور سے دور ہی رکھا گیا۔ سماجی ایمان کی ہماری تاریخ میں کوئی مثال نہیں۔ ان مسلمانوں نے جنکا مذہب اسلام پر پورا عقیدہ و ایمان تھا، مسلم دنیا پر بہت زیادہ سماجی بے انصافیاں کیں اور انفرادی ایمان ان زیادتیوں کو الٹ پلٹ کرنے میں کبھی بھی کامیاب نہیں ہوا۔

اب اگر ہم یہ کہیں کہ ہمارے پاس ایمان ہے اور مغرب کے پاس نہیں ہے تو ہمیں صحیح طور پر یہ سمجھنا چاہیئے کہ ایمان سے ہماری مراد کیا ہے؟ مذہبی عقیدہ رکھنے والوں کے لئے خدا اور انسان کے درمیان تعلقات واضح ہیں۔ لیکن رعیت کے تعلقات اپنے حکمرانوں سے اور فرد کا معاشرہ سے اور معاشرہ کا سماج کے بہت سے دوسرے اجزاء کے ساتھ روابط کی نوعیت کے بارے میں ابھی تک پورے طور پر مطالعہ نہیں ہوا ہے۔ جس کی روشنی میں اس دنیا میں ایمان کی ضروریات کو سمجھنے میں آسانی ہو سکتی ہے۔

اہل مغرب کا عقیدہ ہے کہ انکی تہذیب کی بنیاد آزادی ہے۔ جدید تمدن کے آمد سے پہلے مغرب میں سماجی، سیاسی اور شہری آزادی کا وجود نہیں تھا۔ کیونکہ جدید دور کے مسلمانوں اور قرونِ وُسطیٰ کے دوران زندگی بسر کرنے والے اہل مغرب کا عقیدہ ''نجات'' میں تھا۔ آج کسی طرح کی محدودیت اور پابندیوں سے نجات کو آزادی کا نام دیا جاتا ہے لیکن پرانی دنیا میں اندرونی پابندیوں اور کمیوں سے نجات نیز دنیاوی خواہشوں سے نجات کو آزادی کہا جاتا تھا۔

اسلامی دنیا کے بعض فرقے تو یہ کہتے ہیں کہ ''نجات'' ترک دنیا اور تمام مادی ضروریات کو چھوڑ دینا ہے۔ جس میں معاشرہ اور سماج کو بھی ترک کر دینا شامل ہے۔ فارابی کا خیال ہے کہ ایسے صوفی جو اس قسم کی تردید کا مشورہ دیتے ہیں وہ ناواقف ہیں۔ فارابی کا عقیدہ بھی نجات میں تھا۔ لیکن انکا کہنا تھا کہ مہذب معاشرے میں رہ کر اور جس کی رہنمائی اندرونی پابندیوں اور کوتاہیوں سے دوری حاصل کرنا ہی نجات ہے اس کے مقابلہ میں مغرب میں آزادی اس کے بالکل برعکس ہے یعنی آزادی کا مطلب کسی بھی شخص کی نجی زندگی میں خارجی عوامل کی دخالت سے آزادی تھا جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کی زندگی پر صرف اسی کی حکمرانی ہو۔ مغربی تصور انفرادیت انسانوں کے ابتدائی شعور وادراک اور ان کی خواہشوں کو اولیت دیتا ہے ایک آزاد شخص وہ ہے جسکی ضروریات کی تکمیل میں کوئی چیز مانع نہ ہو۔ یقیناً آزادی کی محدودیت ہے اور وہ ہے دوسروں کی آزادی۔ یہ آزادی مثبت اثرات رکھتی ہے جیسا کہ لوگوں نے اپنی تقدیر کو خود اپنے ہی ہاتھوں میں لیا ہوا اور حکومت لوگوں کی خادم بن جائے اور ان کے سامنے جواب دہ ہو نہ کہ ان کی مالک اسکے برخلاف قدیم زمانہ کے مطلق العنان حکمران عام لوگوں سے بالاتر تھے اور ان کو اپنا مہرہ تصور کرتے تھے جن کا پورا دارومدار انکے حکمرانوں کے رحم وکرم پر تھا۔ لیکن جب لوگوں کو اس غلبہ کی تنگیوں سے نجات ملی تو اجتماعی طور پر وہ اپنے حکمرانوں پر غالب آگئے۔

آزادی کا مطلب کسی خارجی پابندی سے نجات پانا ہے برخلاف مابعد جدیدیت کے اس خیال کے کہ نجات کا مطلب اندرونی پابندیوں سے آزادی

ہے جو سماجی اور سیاسی حقوق اور آزادیوں کو بھلا دیتا ہے۔ یہ دونوں تصور نامکمل ہیں۔
جدید آزادی داخلی آزادی کو نظر انداز کرتی ہے اور اس کو اس بات کی کوئی فکر نہیں ہے کہ آیا انسان کو اپنے جذبات سے نجات ملی۔ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ انسانوں کو انکے حکمرانوں کی خواہشات اور ترنگوں کا تابع نہ ہونا پڑے۔ ہم لوگوں نے اس نظریہ کے برخلاف یہ کوشش کی ہے کہ لوگ اپنی خواہشات کا شکار نہ ہوں اگرچہ اس نظریہ کیوجہ سے ظالموں نے حکومت بھی کی اور مسلم معاشرہ کو زنجیروں سے جکڑ دیا۔ میری تجویز ہے کہ ہم دونوں طرح کی آزادی حاصل کرنے کی کوشش کریں، جیسا ہم قرآن اور اپنے معاشرے کا حوالہ دیتے ہیں۔ ہم مغربی آزادی کے بہت سے پہلوؤں کو رد تو کرتے ہیں لیکن ہم اسکی بہت سی کامیابیوں کا انکار نہیں کر سکتے۔ جب ہم مغرب کے بعض مضبوط اور کمزور نکات میں تمیز کرتے ہیں تو ہمیں اپنی فکر کے بارے میں بھی اسی تنقیدی نکتہ نظر کو اپنانا چاہیئے۔

تعقل پسندی کی مختلف طریقوں سے تعریف کی جا سکتی ہے اور ہمیں یہ بتانا چاہیئے کہ ہم کس قسم کی تعقل پسندی اپنا رہے ہیں۔ افلاطونی، ارسطوئی، نوافلاطونی، اسلامی یا صوفیانہ تعقل پسندی کا تصور، ابن رشد کی تعقل پسندی یا ڈسکارٹس، کانٹ یا ہیگل کی تعقل پسندی۔

میری رائے میں تعقل پسندی تمام انسانوں کا ایک مشترک بندھن ہے۔ ایک ذریعہ جو دنیا میں ایک دوسرے کو جوڑتا ہے۔ یہ وہی عقلیت ہے جسکے ذریعہ سے افلاطون اور ارسطو نے اپنے خیالات کو پہنچایا۔ تعقل پسندی اور ذہانت ایک ایسے

طریقہ کو ظاہر کرتی ہے جس سے اس دنیا کا ادراک اور شعور حاصل ہوتا ہے اگرچہ یہ ادراک اور شعور بھی نسبتی ہے۔ ہمارے عظیم مفکرین اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ فقط تعقل پسندی کے ذریعہ حقیقت کا پتہ نہیں لگایا جا سکتا ہے پھر بھی وہ تعقل پسندی کی غیر معمولی اہمیت کو نظر انداز نہیں کر سکے۔ ہماری مذہبی روایت کا دعویٰ ہے کہ آخرکار دل کا ایمان سے گہرا رشتہ ہوتا ہے ذہانت سے نہیں۔ اور ذہانت پورے حق کا ادراک ہے۔

اگر ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ عقلیت اور ایمان متضاد اور ایک دوسرے کے مخالف ہیں کیونکہ تعقل پسندی اس دنیا پر زیادہ اثر انداز ہوتی ہے اور ایمان اور عقیدہ کو ایک طرف رکھ دیا جاتا ہے۔ اس بات کو دھیان میں رکھنا ضروری ہے کہ جس عقیدہ کی بات میں کر رہا ہوں وہ تعقل پسندی کے ساتھ ساتھ موجود ہے اس کا مخالف نہیں ہے۔ تعقل پسندی ہم کو موت کے بعد کے دروازے تک پہنچاتی ہے باوجود اسکے کہ اسکو یہ معلوم ہے کہ دنیا صرف مادہ تک محدود ہے لیکن یہ اس دنیا سے آگے نہیں جا سکتی۔ اور یہی وہ جگہ ہے جہاں ایمان کو داخل ہونا چاہیئے۔ انسان بغیر عقلیت کے آگے نہیں بڑھ سکتے کیونکہ انکے سامنے عملی مسائل ہیں۔ اور اگر انکو تعقل پسندی اور ایمان کے درمیان کسی ایک کو انتخاب کرنا ہے تو وہ موخر الذکر کا ہی انتخاب کریں گے۔ دنیا کی تعبیر اور تشریح کی اساس تعقل پسندی ہے اور وہ تناسب کے اعتبار سے ہے۔ تناسب ہمارے مذہبی تصورات میں داخل ہے۔ لیکن قرآن اور مذہبی روایت کے سلسلہ میں اگر ہماری فہم و ادرک قریب المرگ ہو جائے اور اسکو بدلنے کی ضرورت ہو تو اسکا مطلب یہ نہیں

ہے کہ روایت اور قرآن پرانے ہو گئے ہیں ہماری ذہانت میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ موجودہ دنیا کو اپنا لیتی ہے اور روایت اور قرآن سے بھی جڑی رہتی ہے۔ اسطرح مذہب کے اصلی جوہر کو کچھ نقصان نہیں پہنچتا۔ اس طرح ہماری مذہبی فکر کی ترقی یقینی ہے۔

انسان بنیادی طور پر خدا کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو روحانیت سے براہ راست ربط میں ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے بہت سے تارک الدنیا لوگوں کے مذہب کے تیئں تعبیرات پر تقدس کا مکھوٹا چڑھا دیا گیا ہے اور ان کو ناقابل تسخیر سمجھا جاتا ہے۔

یہ یقینی ہے کہ انسان روحانی آسودگی کے حصول کیلئے مزید قدم اٹھائینگے معمولی اور مادیاتی وجود ہملوگوں کو لازمی طور پر ایک عذاب میں مبتلا رکھے گا۔ ہمارا ایمان ہے کہ مذہب مادی بھلائی کا مخالف نہیں ہے لیکن وہ تمام انسانوں کو ایک عظیم اونچے مقام کیلئے دعوت دیتا ہے جو مادی دنیا سے بہت اعلیٰ وارفع ہے۔

بحثیت ایک صاحب ایمان کے مجھے یقین ہے کہ مستقبل مذہب کا ہے اور تعقل پسندی کے ایک وکیل کے طور پر میں دیکھ سکتا ہوں کہ آج کے دور میں مذہب کا استقبال کرنے کیلئے لوگ کتنے بیقرار ہیں۔

☆☆☆

چھٹا باب

آج کی دنیا میں مذہبی عقائد

آج کی دنیا میں مذہبی عقائد

ہمارے سامنے مسئلہ یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں مذہب کی حالت کیا ہے؟ اور مذہب کے ماننے والے کن مسائل ومشکلات کا سامنا کرتے ہیں؟ یہاں ہماری مراد تمام مذاہب کے ماننے والوں سے ہے خواہ وہ عیسائی ہوں یا یہودی، لیکن سب سے پہلے مرحلے میں ہماری مراد مسلمانوں سے ہے اگرچہ ان کا اطلاق ان چند مسلموں پر بھی ہوتا ہے جو وقار اور عزت نفس چاہتے ہیں۔

میں ایک ایسے مسلمان کی حیثیت سے، جو اپنے زمانہ میں جینا چاہتا ہے، جس کی توجہ مستقبل پر ہے اور جو عزت ووقار رکھتے ہوئے عمل کرنا چاہتا ہے، مذہب کے بارے میں اپنا سوال پیش کرتا ہوں۔ یہ ایک ذاتی سوال ہے جس میں میں غیر جانب دار اور ناوابستہ نہیں ہوں لیکن ایک ایسے مسلمان کی حیثیت سے جو جستجو کرتا ہے اور جو ضرورت کے تحت بعض معاملات میں مذہب پر باہر سے بھی نظر ڈالتا ہے تا کہ ہم تعصب کی وجہ سے دلدل میں نہ پھنس جائیں اور نسلی جانبداری کی وجہ سے کسی گہرے کھڈ میں نہ گر جائیں۔ پس جب میں یہ سوال کرتا ہوں کہ ہم مسلمان کس حالت میں ہیں تو سوال کے داخلی اور خارجی دونوں پہلوؤں سے اس کی وضاحت ضروری ہے۔

ہم مسلمان ایک زمانہ میں نمایاں تمدن رکھتے تھے اور ایسی انسانی تاریخ کی تعمیر

وتشکیل میں سرگرم تھے جس کی صلاحیت آج ہملوگوں میں باقی نہیں رہ گئی۔ ہم تاریخ
میں دوبارہ اپنی جگہ بنانا چاہتے ہیں اور اگر ممکن ہو تو ایک ایسا مستقبل جو ہمارے حال
اور ماضی سے بھی مختلف ہو لیکن ہم ان لوگوں کی تردید نہیں کرنا چاہتے جو ہم سے مختلف
ہیں اور اس کے ساتھ ہی ساتھ سائنسی، نکتہ نظر اور انسانیت کی عملی کامیابیوں کو نظر انداز
بھی نہیں کرنا چاہتے۔

آج کی دنیا سے میری مراد کیا ہے؟ مختصراً میری مراد مغربی تمدن ہے جس
نے دنیا پر غلبہ حاصل کیا ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا اقتصاد ہماری سیاست
سماجی اور ثقافتی زندگی مغرب کے زیر اثر ہے۔ اسکی کامیابیوں اور میراثوں کو نگاہ میں
رکھے بغیر کے ہم مسلمانوں کی زندگی ناممکن ہے۔ ہم مغرب کا اثر ہر جگہ دیکھتے ہیں۔
شہر کا انتظام اور طریقہ جن میں ہم رہتے ہیں، ارسال اور ابلاغ کی ٹیکنولوجی اور اس
کے علاوہ بہت کچھ جس کا ہم روزمرہ استعمال کرتے ہیں، یہ سب مغرب کی پیداوار
ہیں۔

آج کی دنیا مغربی ہے۔ اپنی اساس ٹیکنیک اور فکر کے اعتبار سے اگر کوئی
مغرب کی جغرافیائی حدود کے باہر بھی رہتا ہو اور مغرب کی اقدار اور زندگی کو اپنے اندر
سموئے ہوئے ہو درحقیقت مغرب نے انسانی دنیا کو عظیم کامیابیاں عطا کی ہیں لیکن
اس نے جو پریشانیاں پیدا کی ہیں انھیں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے لیکن اصلی
مسئلہ یہ ہے کہ ہماری دقتیں دوگنی ہو جاتی ہیں مغرب کے مقابلہ میں کیونکہ اہل مغرب کا
اپنا ایک کلچر ہے جو ان کے تمدن سے میل کھاتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں ان کی شناخت

کے لئے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا لیکن ہمارے مسائل دو چند ہو جاتے ہیں کیونکہ ایک طرف ہماری ذاتی اور سماجی زندگیاں براہ راست مغرب سے متاثر ہیں۔ ایک ایسا تمدن جسکی اساس یا بنیاد سے ہم نہ تو ہم آہنگ ہوئے ہیں نہ اسے ہم نے اپنایا ہے۔ دوسری طرف ہمارے اپنے کلچر کے بعض پہلو ایسے ہیں جن کا تعلق اس تمدن سے ہے جس کا وقت اب گذر گیا اگرچہ تہذیب وتمدن کی کوئی حتمی اور یقینی تعریف نہیں بیان کی گئی لیکن میری رائے میں تمدن سماجی زندگی، اداروں اور تنظیموں کے ان مادی پہلوؤں کا مجموعہ ہے جو سماجی تنظیم کیلئے سیاسی اقتصادی، صنعتی اور دوسرے خاکوں اور ڈھانچوں کے مطابق کام کرتے ہیں جیسا کہ میں سمجھتا ہوں کلچر انسانی معاشرہ میں موجود گہرے عقائد کا افکار کی عادتوں اور جذبات کا مجموعہ ہوتا ہے۔

کچھ لوگ مغرب کے مسائل اور وہاں موجود مختلف النوع پریشانیوں کو انسانی مزاج اور اس کے اغراض کے درمیان موجود ٹکراؤ سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہم لوگ بھی اسی مسئلے سے پریشان ہیں اگرچہ دوسرے درجہ پر۔ لیکن چند مغربی حضرات کے لئے یہ مسئلہ اور بھی زیادہ پریشان کن ہو جاتا ہے کیونکہ وہ تہذیب جس کا اثر ہمارے ذہنوں پر ہے وہ زندگی کی حقیقتوں سے میل نہیں کھاتی۔ اس تضاد اور ٹکراؤ کی وجہ سے موجودہ زمانہ میں، ہم اہل مغرب کے مقابلہ میں زیادہ پریشانیاں جھیلتے ہیں۔

فی الحقیقت ایک تمدن سے کلچر کو الگ کرنا ممکن ہے۔ ایک ثقافت جو ایک تمدن اپناتا ہے اس تمدن کے ختم ہونے کے بعد بھی بہت مدت تک لوگوں کے ذہنوں میں بسی رہتی ہے۔ تمدن درحقیقت کلچر کی بنیاد اور اساس ہوتا ہے اور کلچر سے افتراق

وعلیحد گی کیوجہ سے تمدن اپنی تخلیقی اور جدت پسندی کی صلاحیت کھو دیتا ہے اور دراصل ترقی کی راہ میں ایک رکاوٹ بن جاتا ہے کیونکہ اس کی جڑیں زمین میں بہت گہری نہیں ہوتیں اور آہستہ آہستہ باہر آجاتی ہیں۔ ہمارا ایک مرکزی مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے کلچر کے بہت سے اہم پہلوؤں کا تعلق ایک ایسے تمدن سے ہے جس کا وقت گزر چکا ہے اور ہماری زندگی پر جدید تمدن اپنے اثرات ڈال رہا ہے جس کیلئے ایک مناسب ثقافت کی ضرورت ہے۔

ایک مسلمان کی حیثیت سے ہم اپنا سر اونچا رکھنا چاہتے ہیں اور اپنی تاریخی شناخت کو بھی باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ ہماری تاریخی شناخت اسلام ہے۔ پس سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں ہملوگوں کو کیا کرنا چاہیئے؟

مجھ سے امید نہ کیجئے کہ اس پر میں آپ کو کوئی (menifesto) دونگا۔ اس طرح کے کسی بڑے کام کے سلسلہ میں مجھے اپنی ناقص ذہنی صلاحیت کا اعتراف ہے اور دوسری اہم بات یہ ہے کہ منشوروں کے ذریعہ لوگوں کی زندگیوں کی اصلاح نہیں کی جاسکتی۔ زیادہ اہم مینی فیسٹو وہ تھے جو مارکس اور اینجلس نے بنائے تھے اور جس کا نتیجہ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ یہ دونوں اور خاص طور سے مارکس بہت ذہین اور عظیم مفکر تھے اور سرمایہ دارانہ نظام تشخیص میں غیر معمولی مہارت کے حامل تھے۔

ہم لوگوں کو نہایت خلوص کے ساتھ یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ زندگی بحث، تنقید اور تعاون کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتی۔ اس کے علاوہ انسانی زندگی کی ترقی میں محدودیت اور تناسب کا بھی اہم کردار ہوا کرتا ہے۔ اور اسکی آج ہم یہاں جو تجویز رکھ رہے

ہیں وہ صرف امکانات کا ایک مجموعہ ہے کوئی آخری اور حتمی حل نہیں ہے۔ ہمیں اہم اور سنجیدہ سوالوں کے سلسلے میں مخلصانہ، مفکرانہ اور مزید واضح مذاکروں اور مباحثوں کی ضرورت ہے اور ان سوالوں کا جواب حاصل کرنے لئے لگاتار کوشش بھی درکار ہے۔

سب سے پہلے ہم مذہب پر نظر ڈالتے ہیں۔

مذہب انسانی اداروں میں سب سے زیادہ قدیم ہے۔ مذہبی عقائد کی ناموجودگی اور بلندتر نظام کے سامنے راضی بہ رضا ہونے کے علاوہ زندگی اپنے مفہوم و معنی سے محروم ہو جاتی ہے۔ خواہ وہ اسے چاہیں یا نہ چاہیں انسانوں میں ایک مافوقی ہستی کا احساس جوان کے وجود میں ہوتا ہے اور جس کو انھیں اپنی روحوں کی گہرائیوں سے حاصل کرنا چاہیے۔ انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو جوہر اور اپنی ہستی کے رازوں کو بخوبی جانتا ہے اور اسی وجہ سے وہ ہستی کی فطرت کو کشف کرنا چاہتا ہے۔ ذرا دیکھو اپنی کوششوں کے ذریعہ انسانوں نے آج تک کتنے بہت سے رازوں سے پردہ اُٹھایا ہے۔ لیکن وجود ایک ایسی پیچیدہ چیز ہے کہ جب تک ایک سوال کا جواب ملتا ہے پہ در پہ بہت سے سوالات آجاتے ہیں۔ انسان ایسی مخلوق ہیں جو تخلیق کی مہک اور اس کے راز سے واقف ہیں اور اسی وجہ سے وہ تخلیق کے راز کو بے نقاب کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ انسان عملاً تخلیق کے سلسلے میں گوناگوں پیچیدگیوں اور طرح طرح کے الجھاؤ کے سمندر میں جیتا ہے۔ وجود اور اس سے وابستہ پیچیدگیوں کا مشاہدہ کرتے ہیں اس کی آنکھیں چکاچوندھ ہو جاتی ہیں اور ایسے مرموز ماحول میں انسان کے

سوالوں کے نہایت مضبوط و پائدار اور مستحکم و مخلصانہ جواب مذہب ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جب تک انسانی نسل رہیگی اس وقت تک خوف بھی رہے گا اور جب تک خوف اور دہشت ہوگی زندگی میں مذہب کی ضرورت رہیگی۔ انسان کا ذہن زیادہ محفوظ ہے کسی دوسری شکل سے کیونکہ مذہب انسانی ذہن کی تلاش کے نامکمل جذبہ کو توانائی بخشتا ہے کہ وہ اپنے خالق کو علیم وخبیر سمجھیں۔ کوئی بھی ایسا نہیں ہے کہ وہ اپنے دل میں ایک ہستی لامطلق اور مافوق کا انکار کرے۔ لیکن لوگ عدم موجودگی سے متاثر ہوتے ہیں اور ایک مافوق حقیقت سے لاعلم رہتے ہیں۔ اور اس کے نتیجہ میں اتنا ہی نقصان انکو پہنچتا ہے جیسے دوسری انتہا جو ہمیشہ بدلتی ہوئی صورت کے بارے میں سوچتی رہتی ہے اور اسکو ابدی اور رہنے والا مانتی ہے۔ تاریخ میں بہت سے واقعات ان دونوں غلطیوں سے وجود میں آتے ہیں۔ ایک ملحدانہ زندگی خاص طور سے خدائے واحد کے ماننے والے مذاہب اور مسلمانوں کے عرفان کے خدا سے۔۔ جو توہم پرستوں کے خدا سے مختلف ہے اور فلسفیوں کے خدا سے بھی۔ ایسی زندگی بہت تاریک اور محدود ہوتی ہے۔ یہ ایک خدا ہے جو اعلیٰ اور ارفع شان والا ہے انسان اپنی تمام محدودیتوں اور ناقابلیتوں کے باوجود اس خدا سے براہ راست تعلق قائم کرسکتا ہے اور ایک مخلصانہ جذباتی اور لسانی تعلق قائم کرسکتا ہے۔ ایک ایسی دنیا میں جو پریشانیوں سے اور بے یقینی سے دبی ہوئی ہے انسان ہستی کے اس مرکز سے اپنا رابطہ پیدا کرسکتا ہے اور اس منبع اور مرکز سے اپنے لئے ہدایت اور رہنمائی حاصل کرسکتا ہے یہ ایک ایسا خدا ہے جو عظیم اور کبیر ہے۔ انسان اس سے محبت کرتے ہیں۔ اور اسکی طرف غیر معمولی طور پر راغب

ہیں۔ یہ تعلق اس سے مختلف ہے۔ جیسے کوئی کمزور طاقتور سے ڈرے اور خوف کھائے۔ یہ ایک نامکمل کی تشویش اور اسکی تلاش تکمیل کے لئے اس خدائے کامل اور بے نیاز کے سامنے۔ تعظیم اور تکریم صداقت اور ایمان کی بنیاد ہے اور سچا ایمان تعظیم و تکریم ہے۔ اور تعظیم و تکریم زمین کے تعلق کی پابندیوں سے آزادی۔ خاکی اس دنیا پر انحصار کرتا ہے جبکہ صاحب ایمان دنیا کو اپنی مرضی اور منشاء کے مطابق پاتا ہے۔ خاص طور سے ایک ایسا ذریعہ جس سے ان کی ہستی کے روحانی پہلو کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔

یقیناً ہمارے یہاں ایک منفی عرفان اور زہد بھی ہے۔ یہ سب کے سب انسان کی محدودیت اور خطا پذیری کی علامت ہے جسکو مزید تلاش اور جستجو کرنی چاہیئے۔ ایک عقیدہ رکھنے والا آدمی جو مادی دنیا کو ترک کر دیتا ہے اسکو زیادہ سکون اور آرام حاصل ہوتا ہے اس کے مقابلہ میں جس کے پاس مادی ضرورتیں اور دولت ہے جبکہ اول الذکر کی خوشی اور مسرت ابدی ہے اور موخر الذکر۔ اسکی غذا اور شہوانی خواہشات۔۔ سب عارضی ہیں کیونکہ انکے حصول کے ذرائع سیکڑوں عوامل پر منحصر ہیں ظاہر ہے کہ مستقبل میں حاصل ہونے والی مسرت کے سلسلے میں خوف و تشویش موجودہ زمانے کی خوشی کو بھی نابود کر دیتی ہے۔

پس صحیح بات یہ ہے کہ مذہبی عقیدہ انسان کی روح کی گہرائیوں میں بسا ہوا ہے اور مقدس قرآن کے مطابق انسان کی ساخت مذہبی ہونے کے ساتھ ساتھ وحدت پرستی پر قائم ہے۔ مذہب کی روح مقدس اور افضل ہے اور اگر یہی دو صفات ہم حاصل کر لیں تو پھر ہمیں مذہب کی مزید ضرورت نہیں رہتی اور جہاں کہیں بھی پاکیزگی

اور فوقیت ہے وہی مطلقیت بھی ہے۔ یہاں میں ایسی سب سے بڑی آفت کا ذکر کرنا چاہوں گا جس سے مذہبی زندگی کو خطرہ درپیش ہے۔

انسانی قلب کا تعلق روحانیت اور فوقیت سے ہے اور جب کبھی بھی انسانی ضمیر اس روحانیت سے متصل ہوتا ہے تو یہ خود بخود ایک ایسی روحانیت کی شکل اختیار کر لیتا ہے جو فوقیت کی حامل حقیقت سے نزدیک ہے جس کو خدائی روح کہا جاتا ہے لیکن انسانی وجود کے دو پہلو ہیں فطری اور خدائی۔ انسانوں کے سر آسمان کیطرف بلند ہیں لیکن ان کے پاؤں زمین پر ٹکے ہوئے ہیں یعنی انکو اس کے سیارے یعنی زمین پر رہنے کے لئے تقدیر نے فیصلہ کیا ہوا ہے کیونکہ وہ اس سیارے کے سبب ان کی زندگی اور ان کے دماغوں میں ایک مسلسل طغیانی اور اس دنیا کے بدلتے ہوئے مزاج کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ ایک فطری ہستی ہے اس لئے وہ ایک جگہ پر قائم بھی نہیں رہتا۔ انسانوں کو زمان اور مکان نے اپنے گھیرے میں لیا ہوا ہے اور اس طرح ان کی فکر سہی بھی ہے اور خطاؤں سے بھری ہوئی بھی۔ جو تاریخ سے اثر پذیر ہوتی ہے اور نیتجتاً بدلتی رہتی ہے۔ نہ تو جسم اور نہ ہی دماغ ایک جیسی حالت میں نہیں رہتے ہیں یقیناً میرا یہ عقیدہ نہیں ہے کہ تمام انسانوں کے تصورات نسبی اور انسانی زندگی میں کوئی ٹھہراؤ یا جمود نہیں بلکہ زیادہ تر انسان بناتے ہیں اور رہنمایانہ صلاحیت سے مالا مال ان کا نظریاتی علم زمانہ کا پابند اور عارضی ہے۔ ہمارا علم بھی نسبی اور تغیر پذیر ہے ہمارے عقائد، علم نسبی ہونے سے بچ نہیں سکتے اور انسانوں کے لئے اور کوئی راستہ ہی نہیں کہ وہ اس بے یقینی کے ساتھ آگے بڑھیں اور اپنے علم اور اپنی مہارت کو تجربہ اور غلطیوں کی

کسوٹی پر رکھیں اور اس میں مناسب تبدیلی کریں۔

تاریخ، عقائد اور دنیا کے متعلق ابھرنے والے تصورات کی ارتقاء کا نام ہے۔

کیا انسانی ذہن تاریخ کے بارے میں اسی طرح سوچ رہا ہے؟ مختلف روایات، نظریات اور مذاہب میں اور مذاہب کے تمام فرقوں میں اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ کوئی بھی شخص حقیقت کو تمام پہلوؤں سے سمجھنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ بطور مثال جب ہم اسلام کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔ تو ہماری مراد کس اسلام سے ہوتی ہے؟ ابوذر کا اسلام، بوعلی سینا کا اسلام، غزالی کا اسلام، ابن عربی کا اسلام، شاعروں کا اسلام یا صوفیوں کا اسلام؟ یہ سب کے سب ناقابل انکار تاریخ کے پہلو ہیں جو مذہب انسان کی نسبی فہم و درک کی گواہی دے رہے ہیں۔ آج عقیدہ کے درمیان کسی طرح کا اختلاف نہ ہوتے ہوئے بھی فکر و عمل کی دنیا میں اپنے والدین کے ساتھ بھی ہمارا نظریاتی اختلاف ہے۔

ایک بہت بڑی مشکل جو صاحب ایمان و عقیدہ کے گروہ کو درپیش ہے کہ وہ کچھ حقیقتوں کو مطلق مافوق اور مقدس مان لیتے ہیں۔ اور دوسری جانب خود نسبی ہونے کیوجہ سے وہ ذہن اور جسم نسبی دائرہ میں رہتے ہوئے سب چیزوں کو دیکھتے ہیں۔ جب تک وہ اپنی محدودیت کو تسلیم کرتے ہیں اور اس تضاد کی اصل اور ان کے اندرونی مسائل ان کے لئے کوئی بڑا حادثہ وجود میں نہیں لاتے۔ اہل عقیدہ و ایمان کے لئے زیادہ بڑی مصیبت یہ ہے کہ جب مذہب کی مطلقیت اور پاکیزگی کا اثر زمان و مکان کی محدودیت پر پڑتا ہے اور خطا پذیر انسان مذہب کی تعبیر و تشریح کرتا ہے اور جب

ان کی تجویز کی ہوئی چیزوں کو مذہب سمجھ لیا جاتا ہے۔ ایک ایمان والا آدمی وہی ہوتا ہے جو اس خاص نقطۂ نظر کو فروغ دیتا ہے۔ اور بہت سے اختلافات کی جڑیں اسی نقطہ میں موجود ہیں۔ ہمارے پاس مذہب اور تعقل پسندی کے لئے مشترکہ استعداد ہے یعنی انسانوں میں موجود ذریعہ ارسال اور ابلاغ لوگوں میں باہمی افہام و تفہیم کا وسیلہ اور اگر ہم بھی یہ یقین رکھیں جیسا کہ اکثر فلسفیوں کا خیال ہے کہ انسانی ذہن پر مطلق تصورات غلبہ پا لیتے ہیں اور پھر وہ تمام زمان و مکان کے لئے رواں دواں ہوتے ہیں۔ آیئے ہم اس بات کو تسلیم کریں کہ انسانی فہم و درک اتنی محدود ہے کہ اس کی اکثر نسبی تشریحات اور تعبیرات غلط اور تغیر پذیر ہو سکی ہیں۔ آراء اور عقائد کا وسیع میدان جو مختلف مکاتب فکر اور خود مکاتب فکر کے اندر موجود مختلف عقائد کی حامل جماعتوں کی موجودگی اس دعوے کی تائید میں واضح ثبوت کا درجہ رکھتی ہے۔

کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی ذہن پر مطلقیت کے دروازے بند کر دیئے گئے ہیں؟ ہمیں علم ہے کہ بہت سے مغرب کے جدید فلسفیوں نے اس سوال کا جواب اثبات میں دیا ہے۔ انہوں نے مطلق حقیقت کے وجود کا انکار کیا ہے یا تجویز پیش کی ہے کہ ہمارے پاس ان حقیقتوں کے ادراک کا کوئی ذریعہ نہیں ہے اور اس طرح سے بہت سے مغربی مفکرین اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس دنیاوی سماجی معاشرہ کی زندگی میں مذہب کو ایک طرف رکھ دینا چاہیئے۔

لیکن وہ نیک لوگ جو خدا کے حاضر و ناظر ہونے میں عقیدہ رکھتے ہیں وہ اس بات کو نہیں مانتے۔ اگر چہ کوئی بھی یقینی طریقہ ایسا نہیں ہے جس کی مدد سے اسکو سمجھا

جاسکے۔ عام لوگوں کو ایک ایسی جگہ پر بلانا جہاں وہ نہیں پہنچ سکتے یقیناً ایک غیر دانشمندانہ بات ہے۔

میری رائے میں خدا کو سمجھنے کا محفوظ طریقہ و ذریعہ انسانی قلب ہے ذہن نہیں۔ اور یہ ذریعہ براہ راست تجرباتی رابطہ ہے جس کو ذہن کے ذریعہ سے نہیں حاصل کیا جاسکتا۔ تمام مذاہب نے اس پر بہت زور دیا ہے۔ اسلام کے رہبروں نے ہمکو تعلیم دی ہے کہ دماغ کو خدائے رحمان ورحیم کی عبادت کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے لیکن اس کو سمجھنے کے لئے نہیں۔ ایک اور جگہ انہوں نے تجویز کیا ہے کہ خدائے مطلق تک پہنچنے کا راستہ عبادت ہے اور معلوم سے لامعلوم پر زیادہ زور نہ دینا جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ مطلق اور روشنی تک پہنچنے کا طریقہ عبادت اور اچھا کردار ہے اور اندر کی صفائی کا مطلب یہ ہے کہ خدا کو سمجھنے کا ترجیحی طریقہ براہ راست رابطے کا تجربہ ہے نہ کہ اسکے ادراک کی کوشش۔ یقیناً یہ کسی طرح سے بھی فلسفیانہ اور سائنسی عقلیت کی اہمیت کا انکار نہیں ہے بلکہ اسلام میں خاص طور سے تو ان کے اہم کردار پر زور دیا گیا ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ دماغ کی محدودیت کو تسلیم کیا جائے اور سچ ماننے والا دل کے راستہ پر سفر کرے۔ مذہبی عقیدے کی حقانیت ایک تجربہ ہے فکر نہیں۔ ایک تجربہ جسکی اساس ذاتی بالیدگی، دنیاوی خواہشات پر کنٹرول اور عظیم الشان ہستی کے سامنے سر تسلیم خم کرنا اور اپنے آپکو اپنے محبوب سے مسحور رکھنا ہے اور اگر اس راستہ کو اپنایا جائے تو انسان خدا تک پہنچ سکتا ہے۔ فہم وادراک ایک ذہنی کوشش ہے جسکے ذریعہ سے ایک شخص معلوم سے لامعلوم تصورات تک پہنچ سکتا ہے۔ اور

اسی کے ساتھ ساتھ ایک فرد کی ذات جو زمان و مکان میں مقید ہے اور عقل و ذہن بہر حال ایک نسبی چیز ہے۔

میں نے اب تک جو کچھ عرض کیا ہے وہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ مذہبی تعلیمات میں یہ تمام باتیں بدرجۂ بڑے صوفیاء نے ہمیشہ آگاہ کیا ہے کہ ذہن نارسا ہے کہ دماغ کی تعقل پسندی ایک چھوٹی چیز ہے جسکی بنیاد کافی کمزور ہے۔ اہم نکتہ یہ ہے کہ بڑا فلسفی جیسے ابوسینا جو انسانی ذہن کے گھٹانے اور بڑھانے کی قوت میں یقین رکھتے تھے۔ انھوں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ تصوراتی ذہن ہمیں خدا تک پہنچا سکتا ہے۔ انسانی ذہن اگر اپنی صلاحیت کی آخری حد تک سفر کرے تو مافوق کی سرحد تک پہونچ سکتا ہے خدائے مطلق تک نہیں۔

قلب کا راستہ ہمیں حق اور حقانیت کی طرف لے جاتا ہے۔ مذہبی تجربہ روح کی گہرائیوں سے حاصل ہوتا ہے۔ بہت سے فلسفیوں اور عارفوں نے کوشش کی ہے کہ مذہبی معاملات میں عقل کی ناکامیوں کو نمایاں کریں لیکن راستہ پھر بھی تجرباتی رہتا ہے نہ کہ عقلی۔ نازک نکتہ یہاں پر یہ ہے کہ دل کا راستہ جو ہمیں یقینی طور پر خدا تک پہنچاتا ہے اس پر سفر تنہا کیا جاسکتا ہے۔ نہ تو کسی مذہبی شخصیت کی پیروی سے کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس روشنی کو دوسری طرف منتقل کیا جاسکتا ہے۔

اسی طرح سے انسان اجتماعی مخلوق کی حیثیت رکھتے ہیں جن کا اس دنیا میں رہنا ضروری ہے اور اسطرح کی ہستی کے لئے بہت سے حالات میں دوسروں سے اشتراک کرنا پڑتا ہے جو دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ زبان بھی ایک بہت اہم سبب وسیلہ

ہے انسانوں میں رابطے کی ایجاد کا لیکن زبان ایک بیرونی اظہار ہے وہ اس نفسیاتی حقیقت کا انعکاس ہے جو انسانی ذہن میں موجود ہے۔ انسان زبان کے ذریعہ ترجمہ کرتا ہے اور دوسروں تک ترجمہ کو پہونچانے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ ایک آدمی عقل کے ذریعہ سے سمجھ سکتا ہے کہ ذہن اور روشنی میں کیا رابطہ ہے اور یہ روشنی انسانی شعور و ادراک ہے اور یہ ادراک کبھی کبھی انسانوں کے اختیار سے باہر ہو جاتا ہے۔ انسانی ذہانت کی کوئی حد نہیں ہے۔ اور سچ بات تو یہ ہے کہ انسانی ہستی کی عظمت کو مادیت اور فطری چیزوں میں محدود نہیں کیا جا سکتا جبکہ انسان زمان و مکان میں مقید ہے اور اسطرح سے اسکا تصور نامکمل اور کٹا ہوا ہے۔ بہر صورت انسان اپنے جذبات سے متاثر ہوتے ہیں اور انکی روشنی انکے جذبات سے ہی نکلتی ہے اگر چہ یہ جذباتیت نسبی اور خطا پذیر ہے۔ اس کے ذریعہ اصل انسان کی ترجمانی مطلق نہیں ہو سکتی۔

انسانوں میں اعلیٰ مخلوق ہونے کی نشانیاں موجود ہیں۔ اور انسان فطرت کے معاملات میں فطرت عطا کردہ اپنے خطا پذیر ذہن کا استعمال کرتے ہیں۔ اس ذہن سے انسان دو مختلف مادوں کو محسوس کرنے کی کوشش کرتا ہے ایک فطرت اور دوسرا مافوق فطرت۔ دنیا کو سمجھنے کے باوجود انسانی شعور کے نسبی ہونے کے بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ مذہب ایک مطلقیت ہے جیسا کہ انکا محدود اور نامکمل نظریہ مذہب کے بارے میں ہے لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اور انسانی زندگی میں تبدیلی آنے کی وجہ سے کافی حد تک اب پرانی تعبیرات باقی نہیں رہ گئی ہیں۔ مذہبی مسائل کے بارے میں اپنے ناقص نظریہ سے کام لینے کے بجائے اگر، کھلے ذہن سے دیکھیں

تو مذہب کے سلسلے میں ایک متحرک اور مکمل نظریہ قائم کر سکتے ہیں لیکن یہ لوگ اپنی ناقص رائے کو حقیقت پر تھوپنے کی کوشش کرتے ہیں جو لمبی مدت کے لئے تو ناممکن ہے لیکن تھوڑی مدت میں ہی اس کی وجہ سے بہت ساری مصیبتوں کا آغاز ہو جاتا ہے۔ آج فطرت کے بارے میں انسانی نظرے ان پرانی قدیم تعبیرات سے خاصہ مختلف ہیں کچھ لوگ انسانی تعبیرات اور ترجمانی پر تقدیس کی قلعی چڑھا دیتے ہیں۔ عیسائی تاریخ میں ایک خاص تعبیر فکری دنیا کے بارے میں پھیلائی گئی، جسکو پھیلانے والا کیتھولک چرچ تھا اور صدیوں تک اس منجمد رائے میں کسی طرح کوئی کرن نہیں داخل ہونے دی گئی اور کئی طرح کی مشکلات مفکرین اور سائنسدانوں پر تھوپی گئی لیکن یہ فکر آہستہ آہستہ بدل گئی اور آج بہت کم، خواہ وہ عیسائی ہوں یا اور مذہب کے ماننے والے، ان کا عقیدہ ہے کہ مقدس کتابیں اور خدا سے براہ راست رابطہ فطری چیزوں کے ادراک کے لئے انسانوں کی رہنمائی کرسکتا ہے۔ اس کے برعکس سب نے یہ قبول کیا ہے کہ دنیا اور فطرت کے ادراک کے لئے ہمیں تعقل پسندی اور ذہانت سے کام لینا چاہیئے تا کہ ایسے نظریات پر اتفاق ہو سکے جو قابل قبول بھی ہوں اور جسمیں سوالوں کے جواب دینے اور ضرورتوں کو پوری کرانے کی صلاحیت ہو۔ یہ نظریات مسلسل غلط ثابت ہوتے رہتے ہیں لیکن یہ رائے ابھی تک انسانی علوم میں قبول نہیں کی گئی ہے۔ یقیناً ہم نظریہ اور قومی مشاہدہ میں فرق کریں تا کہ مفکرین اور فلسفیوں کو موقع ملے کہ وہ سائنسی علوم کے عام اور دائمی اصولوں کے بارے میں سوچ سکیں۔

صرف فطری دنیا کے علم کے بارے میں ہی نہیں بلکہ مذہب کے سلسلے میں بھی

اب تک بیان کی گئی تمام تعبیرات محدود ہیں۔ پھر بھی یہ مذہب کے سلسلہ میں انسانوں کے شعور کی محدود نوعیت مذہب کی حیثیت کو کم نہیں کرتی جب تک کہ ماننے والے مذہب کی تعبیرات میں غلطی نہیں کرتے۔ اس طرح کی غلطی سے تاریخ میں بہت سارے الجھاؤ پیدا ہوگئے اور مذہب کے بارے میں لوگوں کے وہم بڑھ گئے ہیں کیونکہ حقیقی تعبیرات میں تبدیلی کردی گئی ہے۔ موجودہ زمانہ میں مذہب کی سب سے بڑی خدمت یہ ہوگی کہ ہم اپنی غیر معمولی ہمت کے ساتھ مذہب کی روح اور اس کی نامکمل ترجمانی کے درمیان فرق کو اس طرح واضح کردیں کہ مذہب اپنے ماننے والوں کے قلب میں بہت گہری اور اہم جگہ اس طرح حاصل کرلے کہ ہم مذہبی فکر کو اپنے وقت کے مطالبات کے مطابق بدل سکتے ہیں۔ کتب تاریخ میں مذہب کے سلسلے میں مختلف قسم کے افکار و عقائد موجود ہیں اور ہمیں ہرگز یہ خیال نہ کرنا چاہیے مذہب کے سلسلے میں صرف ہمارا عقیدہ ہی ایک واحد عقیدہ ہے بلکہ ہمیں یہ خیال رکھنا چاہیے کہ ہم مذہبی منابع و مآخذ کا، جن میں لگاتار تبدیلی ہوتی رہتی ہے، واضح اور منطقی راہ وروش کے ساتھ استعمال کریں سچ تو یہ ہے کہ یہ مقدس امور و معاملات ہیں لیکن ان مقدس باتوں کی ترجمانی کرنے والا تو بہر حال انسان ہے۔ اس حقیقی وضاحت کے بعد ہی لوگ کھلے ذہنوں کے ساتھ دوسروں کے تجربات اور ان کی ایجادات کا مطالعہ و مشاہدہ کریں گے۔

اس سلسلہ میں لگاتار بدلے ہوئے سوالات اور ضرورتوں کے درمیان توازن، کے ذریعہ ایک مفید اور عملی مذہب کا ادراک کرسکتے ہیں۔ درحقیقت مذاہب

کی جملہ تعبیرات کو مساوی طور پر درست قرار نہیں دیا جا سکتا ہے بالکل اسی طرح جیسے دنیاوی فطرت کے سلسلے میں ایک عام آدمی کے بیان کو علم طبعیات (Physics) اور علم حیاتیات (Biology) کے ماہرین کے بیان کے برابر نہیں تسلیم کیا جاتا ہے۔ مذہب کی جائز تعبیر، جیسا کہ سائنسی سوچ ہے، کے لئے ضروری ہے کہ ہم قابل اعتماد منابع کو تسلیم کریں جو مسلمانوں کی نظر میں قرآن مجید ہے اور ماضی کے ان طریقوں کا علم جس سے مذہبی روشنی تک پہنچا جا سکتا ہے۔ ابھی تک ہم صرف مذہب کی تعبیرات میں پھنسے ہوئے ہیں جبکہ مذہب کی ابدی زندگی کو یقینی بنانے کے لئے اس کا ادراک اور اس کو تسلیم کرنا ضروری ہے کیونکہ مذہبیات کی تعبیر کسی خاص زمان و مکان کے دائرے میں نہیں کی جا سکتی۔ یہی وہ رائے ہے جو ماننے والوں کی زندگی کے تمام پہلوؤں کی ترقی کا دروازہ کھولتے ہوئے کسی ایسی غلط فکر کو اسمیں داخل نہ ہونے دے جو ہماری فکر اور ترقی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کر دے لیکن دھیان رہے کہ مذہب کا جوہر پوری طرح محفوظ رہے۔

اس کے ساتھ ساتھ مذہب کے سلسلے میں ایک متحرک اور عملی نکتہ نظر اس بات پر منحصر ہوتا ہے کہ ہوشیاری کے ساتھ اس دنیا میں باقی رہ جائے اور اسمیں یہ صلاحیت بھی باقی رہے کہ اپنی تاریخی شناخت کو کھوئے بغیر وہ نئے حقائق کو جھیلنے اور انھیں سنوارنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ میری رائے میں مغربی تمدن اس دور کی بہت ہی اہم حقیقت ہے اگرچہ سیاسی اعتبار سے مغرب کا رویہ ہمارے تئیں دوستانہ نہیں ہے۔ اور ان کے ساتھ کچھ غیر مغربی لوگ بھی ہیں جو مغرب کے سیاسی اور اقتصادی

مظالم کے درد سے آشنا ہیں۔ خواہ وہ قدیم نوآبادیاتی نظام کے دوران کئے جانے والے مغربی مظالم ہوں یا وسعت پسندی پر مشتمل مغرب کے موجودہ ظالمانہ راہ وروش لیکن مغرب کی سیاسی واقتصادی پالیسی درحقیقت تمدن کا ایک پہلو ہے۔ پورا مغرب ایک تمدن ہے جس کی اپنی ایک تہذیب ہے اور یہ تمدن اپنے خاص دنیاوی نقطۂ نظر اور اقدار کے نظام پر منحصر ہے۔ بغیر ان اقدار کو سمجھے ہوئے ہماری گرفت مغرب کے سلسلہ میں بہت ہی سطحی اور گمراہ کن ہوگی۔ جائزہ لیتے وقت ہمیں مغرب کے تئیں اپنی سخت نفرت کو ترک کرتے ہوئے یہ خیال رکھنا لازمی ہے کہ ہم مغرب کے دیوانے بھی نہ بنیں۔ پس ایک طرف ہم مغربی خطرات کے سلسلہ میں خبردار رہیں اور دوسری طرف اس کی انسانی کامیابیوں سے پورا پورا فائدہ بھی اٹھائیں۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم تاریخی اور بلوغیت کے ایک ایسے مرحلہ میں داخل ہو جائیں کہ جہاں ترک اور اختیار کی قدرت اور اختیار میں جو ذمہ داریاں شامل ہیں ان سب کو نبھانے کی مہارت وصلاحیت پیدا ہو جائے۔

ساتواں باب

خوف اور امیدیں

خوف اور امیدیں

ہمارے انقلاب کے مقاصد اور اعلیٰ معیاروں کی مخالفت کرنے والے بھی اس کی عظمت کے قائل ہیں۔ ہمارے خلاف منصوبہ بندی اور سازشوں کی بھرمار سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ ہماراانقلاب بہت ہی سنجیدہ ہے اوراس نے اپنے دشمنوں سے بھی اپنی ناقابل انکارعظمت منوالیا ہے۔ اسلامی انقلاب صرف مسلم دنیا پر ہی نہیں بلکہ اسکے باہر بھی پوری طرح اثر انداز رہا ہے۔ اس نے مسلمانوں اور کمزور لوگوں کوایک نئی امید دلائی ہے بالخصوص ان کمزورحضرات کو جوآزادی اور انصاف کے طالب ہیں۔ دنیا کی فکراورسیاسی فضا کو اس انقلاب نے ہلاکر رکھدیا ہے۔

اس طرح کی تبدیلی زیادہ مدد نہیں کرتی البتہ اس کیوجہ سے اختلافات، ٹکراؤ اورتشویش ناک معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ پس اسلامی انقلاب کے بعد رونما ہونے والے ہمارے معاشرہ میں موجودتشویش اس تبدیلی کا نتیجہ ہے جس سے گزرتے ہوئے ہم تاریخ کے ایک نئے دور میں داخل ہوگئے ہیں لیکن اسمیں کوئی تشویش کی بات نہیں ہے۔

اس کے ساتھ وہ نسبت اور سنجیدگی اور وہ خدشات اور امیدیں جواس تبدیلی سے پیداہوئی ہیں، وہ بہت عظیم بھی ہیں۔ وہ خدشہ اور خوف جس سے انقلاب کو خطرہ

لاحق ہے اور وہ امید جو تابناک انقلابی معاشرہ کے مستقبل کی ضرورتوں کو پورا کرنے والی ہے۔

پس مفکرین سے ہم توقع کرتے ہیں کہ وہ صرف انقلاب کے ستونوں سے واقفیت حاصل نہ کریں بلکہ ان مسائل سے بھی آگاہ ہوں اہم مسئلہ اور مقابلہ جس سے آج یہ انقلاب دوچار ہے۔ مفکرین کو انقلاب اور موجودہ دنیا کی تازہ حقیقتوں کے درمیان تعلقات پر بھی روشنی ڈالنی چاہے اور صرف اسی طریقہ سے ہم لوگ اسکو محفوظ رکھ سکتے ہیں جو سچ اور منصفانہ ہے اور جس کو بدلا نہیں جا سکتا۔

میرے خیال میں ابتدائی مرحلہ میں ہمارے انقلاب کا مقابلہ اس بنیادی اختلاف سے ہے جو انقلاب کے ستون اور معاشرہ میں رائج چیزوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔ مذہبی اختلاف اس کا ایک ستون ہے اور یہ آج ساری دنیا میں موجود ہے۔ ہمارے انقلاب کی عالمانہ بنیادیں اور اس کے اغراض ومقاصد اور عالمی سطح پر رائج اقدار کے درمیان شدید اختلاف وٹکراؤ اور کبھی کبھی ان قدروں کی مکمل تردید ہے۔ یہ فطری بات ہے کیونکہ پہلے سے موجود نظام سے ہر انقلاب کی مخالفت ہوتی ہے اور اسی بنیاد پر سب سے پہلے ان مسائل کو اٹھایا جا سکتا ہے لیکن ہمارے معاملہ میں یہ مخالفت خصوصی اور شدید ہے کیونکہ ہمارے مخالفین دنیا کے مختلف نظریات سے طاقت حاصل کرتے ہیں۔

تمام دنیا نے دانشمندانہ فکر، سیاسی نظام اور بالغ النظری پر مبنی ہمارے انقلاب کی مخالفت کی۔ صدیوں سے اس انقلاب کی تیاریاں چل رہی تھیں۔ اور مذہبی